عشق مری انتہا

سید آلِ اظہر آنسؔ

عشق مری انتہا

سید آلِ اظہر آنِس

عشق مری انتہا

سید آلِ اظہر آنِسؔ

فانوس پبلی کیشنز
راول پنڈی، پاکستان

کتاب: عشق مری انتہا

شاعر: سید آلِ اظہر آنس

سابق پروفیسر، ایف۔جی۔ سرسید کالج، دی مال ، راول پنڈی

0333-5725100

مطبع: الحرمین پرنٹرز، 54/62 بینک روڈ، صدر، راول پنڈی

فون: 92-51-5510182

فیکس: 92-51-5510185

ناشر: جمیل النبی ناصر

فانوس پبلی کیشنز، 54/62 بینک روڈ، صدر، راول پنڈی

اشاعت: مئی ۲۰۱۷

تعداد: 500

ڈیزائن سرورق: جمیل ناصر لودھی

کمپوزنگ: نذیر احمد

0334-5096186

ISBN
969-8300-07-4

قیمت : -/300 روپے

کتاب ملنے کا پتہ

فانوس پبلی کیشنز

54/62 بینک روڈ، صدر، راول پنڈی

فون: 0185 551 51-92+

سید آلِ صفی پیرزادہ

اُن کی والدہ محترمہ اور بہنوں کے نام

عشق تری انتہا ، عشق مری انتہا
تو بھی ابھی ناتمام ، میں بھی ابھی ناتمام

ترتیب

نظم

طنز ومزاح

قطعات

تقریبات

فرد

گلاب

سید آلِ اظہر آنسؔ کی شاعری

''عشق مری انتہا'' سید آلِ اظہر آنسؔ کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل اُن کا نعت اور منقبت کا مجموعہ ''اَشکِ سَحَر گاہی'' حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے جو اُن کی تخلیقی صلاحیت کا بھر پور غماز ہے۔

''عشق مری انتہا'' میں سَید آلِ اظہر آنس نے غزل، پابند نظم، معرّیٰ نظم، قطعہ اور فرد کی صورت میں اپنے شعری تجربے کی ترسیل کی ہے۔

''عشق مری انتہا'' کی غزلوں میں آلِ اظہر آنسؔ کے تخلیقی تجربے کی تہہ میں ایسے شاعرانہ شعور کا سراغ ملتا ہے جو زندگی کو خودی اور بے خودی، معلوم اور نا معلوم، موجود اور ماورا اور طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی حقائق کی روشنی میں دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ انہوں نے زندگی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نہ صرف اپنی داخلی **Urge** سے ناطہ جوڑا ہے بلکہ اپنی سماجی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار کو بھی راہ نما بنایا ہے۔ آنسؔ صاحب نے اپنے احساس، جذبہ اور شعور کو غزل میں اس طرح سمو دیا ہے کہ حقیقی اور مجازی عشق کی حدود ایک دوسرے سے ملتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں:

تجھ بن میرا جینا مشکل
تیرے بنا میں کس در جاؤں
منگتا ہوں میں تیرے در کا
خوش ہوں چاہے پتھر کھاؤں
گاتی ہے دُنیا گیت ملن کے
رنج والم کے گیت میں گاؤں

ان اشعار میں شاعر نے اپنے فکری و نظری تشخص کو واضح کر دیا ہے اور دُنیا کے ساتھ اپنا تقابل اور موازنہ بھی کیا ہے۔

سید آلِ اظہر آنسؔ کے ہاں عشق کمال حاصل کرنے کی سعی کا نام ہے۔ عشق کی بدولت شاعر کو زندگی با معنی لگتی ہے۔ اُن کی غزل میں ایک منکسر المزاج اور باوقار عاشق کا کردار بیان ہوا ہے جس نے آغاز میں رازِ اُلفت کو چھپانے کی سعی کی اور عشق کے پیمانے کو کم کم چھلکنے دیا۔ زیادہ تر اپنی باطنی قوت سے محبوب کے بخشے ہوئے غموں کو گوارا کر لیا۔ محبوب سے حال دل کہا بھی تو شعر کے پردے میں۔ لیکن کبھی کبھی محبوب کے دل کو چھیلنے کے لیے طنز کے تیر چلائے ہیں اور اُس کے بے نیازانہ رویے کو ہدفِ تنقید بھی بنایا ہے۔ مجموعی طور پر اُن کی غزل سے ایک ایسا عاشق نمودار ہوا ہے جو سراپا ایثار ہے اور محبوب کے ظلم وستم کو برداشت کر لیتا ہے۔ شاید اِسی لیے آنسؔ صاحب نے اپنے آپ کو پُرانی راہ والا کہا ہے اور ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ یہ نیا دور ہے، اس کے محبت کے انداز جداگانہ ہیں:

دنیا والے ہر قدم پر دیتے ہیں اک غم نیا
ہو گیا مشہور ناحق اُن سے دکھ پانے کا نام

ہر اک اچھی بری ہم نے سہی ہے
مگر اب ہم سے پہلو تہی ہے

اُلفت میں سدا اُن کی مدہوش سا رہتا ہوں
گردش میں ہیں پھر کیوں اَب یہ جام خدا جانے

آتے ہیں نہ جاتے ہیں نہ بات ہی سنتے ہیں
کیوں بیٹھا ہوں راہوں میں سرِ شام خدا جانے

ترے کوچے میں ہر چھوٹا بڑا ہم کو پکارے ہے
مراسم بڑھ گئے اپنے غمِ دوراں کے کھانے سے

ہے یہ اک رازِ سر بستہ جو آنسِ پہ نہیں کھلتا
کسی بے حِس سے اُلفت ہے یا پھر بودم پہ مرتے ہیں

رہِ الفت میں قدم رکھنا کٹھن ہے اِک تو
اور ستم یہ کہ یہاں کوئی بسیرا بھی نہیں
دو گھڑی اور ٹھہر جاؤ کہ ہے وصل کی شب
صبحِ کاذب ہے ابھی کوئی سویرا بھی نہیں

ایک غزل کا مطلع اور چند اشعار دیکھیے:

ستم ایجاد نے ہم پر بہت ہی ظلم ڈھائے ہیں
کبھی ہنس کر جلایا ہے کبھی غمزے دِکھائے ہیں
سُنا ہے مضطرب انساں پسند ہے شوخ سیرت کو
اسی جذبہ سے ہم نے دِل جگر اپنے جلائے ہیں
سمجھتا ہوں مری الفت ہے معراجِ محبت تک
سمجھ سکتا نہیں پھر بھی وہ کیوں پہلو بچائے ہیں

ہم اُن کے دِل میں اپنی حیثیت پہچان کر آنسؔ
کبھی حیراں ہوتے ہیں کبھی آنسو بہائے ہیں

آلِ اظہر آنسؔ کی غزل میں رقیب، واعظ، شیخ، ناصح، وفا، جفا، شمع، پروانہ، خرد، دل، دیوانگی، دیوانہ، اور زلف جیسی لفظیات کا استعمال بھی ملتا ہے جس سے ایک تو اُن کے کلاسیکی مزاج کا پتا چلتا ہے اور دوسرے اُن کے شعری تجربے کے نقوش اور خدوخال بھی کسی حد تک اُجاگر ہو جاتے ہیں۔ اُن کی غزل کا عمومی رنگ ہجر و وصال کی کیفیات سے ترتیب پاتا ہے تاہم اُنہوں نے اپنے عہد کے ظلم و جبر، اقتصادی بدحالی، سیاسی گھٹن، معاشرتی ناہمواری اور ناانصافی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ آنسؔ صاحب نے زیادہ تر اردو غزل کے مسلمات کو قبول کرتے ہوئے غزل کہی ہے لیکن کہیں کہیں ان مسلمات سے انحراف بھی کیا ہے اور بے قافیہ غزل کہی ہے۔ قافیے کو بالعموم تخلیقی تجربے کے اظہار میں ایک رکاوٹ خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں قافیہ تخلیقی اظہار میں رکاوٹ بنتا ہے وہاں یہ خیال سجھاتا بھی ہے۔ سید آلِ اظہر آنسؔ کی بے قافیہ غزل میں شعری تجربہ اپنے اصلی اور حقیقی رنگ میں ظاہر ہوا ہے:

ہر نفس ہے ابتلا میں مُبتلا
رنگ محفل کا ہے پھیکا آج کل
آؤ صحرا میں ہوں گوشہ گیر اَب
شہر کی تو زندگی شرمندگی ہے آج کل

اُن کا ایک قطعہ بھی دیکھتے چلیے، جس میں اسی تجربے کو موضوع بنایا گیا ہے:

ایک سرکاری ملازم نے بجٹ سن کر کہا
شہر سے اب بوریا بستر اٹھانا چاہیے
اس طرح مقروض رہ کر جی سکوں گا کب تلک
اب کوئی ویرانہ ہی جا کر بسانا چاہیے

اس مجموعے کی نظموں میں آلِ اظہر آنسؔ نے اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت اور زوال کا ایک وسیع تر تاریخی اور تہذیبی تناظر میں جائزہ لیا ہے:

ہم تو اک عرصہ سے ہیں غافل یوں ہی
پستیوں کی سمت ہیں بڑھتے ہوئے
غفلتیں کچھ آج کل کی تو نہیں
کم سے کم ہے دو صدی کا یہ سفر

(خشک سالی کے لیے ایک نظم)

ان کی نظمیں سیاسی بے اعتباری، معاشرتی انحطاط اور اس کے نتیجے میں اقدار کی شکست و ریخت اور فرد کے زوال کو موضوع بناتی ہیں اور جوش کردار سے تقدیر کے راز کھولنے کے جتن کرتی ہیں۔ ان نظموں میں ایک مخلص داعی اور راہبر قوم کی طرح معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی اصلاح کے لیے سرگرم عمل رہنے کا جذبہ ملتا ہے۔ یہ نظمیں ان تصورات اور روایات کا خزانہ بھی پیش کرتی ہیں جو پاکستان کی تعمیر و ترقی اور اس کے ثقافتی اور تہذیبی ڈھانچے کی تعمیر نو کے لیے معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

آلِ اظہر آنس صاحبِ دل ہیں۔ ان کی نظمیہ شاعری ہماری سماجی، سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی غلامی کی زنجیریں توڑتے ہوئے حریت فکر سے آشنا کرتی ہے۔ ذوق عمل، عزم و ہمت اور ایمان و یقین کو ایک نئی توانائی عطا کرتی ہے۔ بعض نظمیں رسومِ زیست اور کاسۂ گدائی کو توڑنے اور معاشرے کو نکھارنے کے لیے جذبہ عشق اور ذوقِ جہاد کو ابھارتی ہیں اور ساتھ یہ محاسبہ بھی کرتی ہیں کہ اب ہمیں راہِ خدا میں جان دینے میں کیوں لذت نہیں ملتی۔ وہ جذبے جو ہماری ایمانیاتی اساس کو مضبوط کرتے ہیں اُن سے ہم بے گانہ کیوں ہو گئے ہیں۔ کچھ نظمیں ہماری مخصوص ثقافتی جہات کو ظاہر کرتی ہیں جیسے نظم ''پٹھان'' میں موجودہ زمانے میں پٹھانوں کے احوال و مقامات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس مجموعۂ شعر میں ''تقاریب'' کے عنوان سے ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن میں لمحہ موجود کے نشانات کے ساتھ ساتھ ہماری ان تہذیبی اور روایتی اقدار کا عطر بھی موجود ہے جو برِ صغیر کے دینی ماحول اور مذہبی گھرانوں کا خاصہ ہے۔

عہد حاضر کے سیاق و سباق میں آلِ اظہر آنس کی شاعری میں ایک ایسے راہ نما کی طلب بھی موجود ہے جو خلوص اور ایثار کا پیکر ہو۔ جس کے فکر و تدبر کی بدولت ہمارے خواب حقیقت میں بدل جائیں، ملک و ملت کا بول بالا ہو اور ایک نئے دور کا آغاز ہو۔ شاعر کا لہجہ امید افزا ہے۔ وہ فکر دنیا میں سر کھپانے کے باوجود احساسِ زیاں کا اسیر نہیں۔ وہ ناساز گار حالات میں بھی مایوسی اور بے عملی کا شکار ہوئے بغیر، عشق کی قوت سے روشن زمانوں کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ دُنیا کو نئے صبح و شام عطا کرنے کا تمنائی اور ارض پاکستان میں ہریالی، شادابی اور تازگی دیکھنے کا آرزو مند ہے۔ نظموں کے یہ اقتباسات دیکھیے جو شاعر کے طرز احساس، انداز نظر اور شعری اسلوب کی شناخت میں معاونت کرتے ہیں:

ہر اک چیز ہے اِک مجسم کتاب
نہیں ایک بابی کتابِ حیات

ہر اک کج فہم اک گزشتہ سبق
تو ذی فہم دے ہیں نیا اِک سبق
پڑھو غور سے یہ کتاب حیات
اور ہر صفحے سے نوٹ لیتے رہو

(کتابِ حیات)

وہ پلٹتے تھے کوڑے کو یوں بار بار
جیسے انعامی کوپن ہے یاں گم ہوا

(کوڑے کے ڈھیر پر)

عجب طور دنیا کا یہ ہو گیا ہے
ہر اک اپنا اپنا ہی غم کھائے جائے

(مفلس کے لیے خوشی کا دن)

دولت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں
ہر کام سے، ہر جذبہ سے اب پیسہ بڑا ہے

(بدلتی قدریں)

بعض راتوں میں قدر ہوتی ہے
بعض باتوں میں قدر ہوتی ہے
کبھی راتوں میں بات ہوتی ہے
کبھی باتوں میں رات ہوتی ہے

(رات اور بات)

مجھ کو تاجر لوٹتا ہے، ہے یہ گاہک کا خیال
بس نہیں چلتا نہ چھوڑے میرے سر پر ایک بال

(اعتماد)

گزشتہ شب اچانک شوق اٹھا خودستائی کا
نہ خود سوئے نہ مجھ کو ایک پل کو نیند آئی ہے

(حضرتِ دل)

نگاہ کے سامنے ایسے مناظر بھی یہ لاتا ہے
کہ اِنساں دیکھتے ہی شرم سے آنکھیں جھکاتا ہے
نیگیٹو اس کا کام آتا ہے اکثر چال بازی میں
بہت ہی کام کی شے ہے یہ فنِ جعل سازی میں

(کیمرا)

تیری کرنیں تیر کی مانند پھیلیں اس طرح
دشمنانِ ملک وملت کے بدل ڈالے چلن

(کوہِ چاغی)

روشنی ، تابندگی اب کارواں در کارواں
ہو رہی ہے میری ماں دھرتی پہ آ کے خیمہ زن

(روشنی کی کرن)

جسموں کو ختم کر کے، غاصب کو کیا ملے گا
یہ حریت کا جذبہ، روحوں میں پل رہا ہے

(کشمیر جل رہا ہے)

ماں کی تربت پر مجھے آئے سکوں
ماں کی تربت مجھ کو ماں جیسی لگے

(والدہ مرحومہ کی یاد میں)

''عشق مری انتہا'' کی کچھ منظومات میں طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور یہ نسبتاً گہرا اور تازہ بھی ہے۔اس اندازِ شعر سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمہ پہلو اصلاح شاعر کا مطمحِ نظر ہے۔

خود مٹائیں جو رونق گلشن
پھر ہو گلچیں کا احتمال کہاں
اعضا شکنی گزر گئی حد سے
شاعری کی مجھے مجال کہاں

(ٹائیفائیڈ کا ٹیکہ لگنے پر)

دیکھو تو آج کل کے یہ بچے
پیدا ہوتے ہی آنکھ کھولے ہیں
آنکھ کھولے پٹر پٹر دیکھیں
سامنے اُن کے ٹی۔وی یوریا ہے
دائیں کمپیوٹر گویا ''سنڈ افاس''
بائیں کیبل کی ''پولٹن سی'' ہے
یہ دوائیں اثر دکھاتی ہیں

ان کے بچپن کے بھول پن کو یوں
چند سالوں میں ہی بھگاتی ہیں
کشت ہستی میں بھولپن جیسے
''دنبی سِتّی'' ہے یا ہے ''جنگلی جیؔ''

(آج کل کے یہ بچے)

قطعات میں بھی ہمارے عہد کے جبر و استبداد، بے یقینی اور بے حسی کی صورت حال کو ہلکے پھلکے انداز میں بیان کیا گیا ہے:

زمانہ نہ جانے کہاں جا رہا ہے
ہو کھانا یا پینا رسومات ہیں
ولادت ہو بچپن، جوانی، ضعیفی
ہو مرنا یا جینا رسومات ہیں

(رسومات)

بہت بھاری قدموں کی آہٹ ہے آتی
یوں محسوس ہو مولا جٹ آرہا ہے
جسے دیکھو لگتا ہے لرزاں و ترساں
جو پوچھا، کہا کہ بجٹ آرہا ہے

(بجٹ آرہا ہے)

ہو گئے ہیں حبیب ایم۔اے پاس
درجہ اوّل ہے آیا ان کو راس
اے خدا جلد نوکری بھی ملے
کاٹنے کی نہ آئے نوبت گھاس

(ایم۔اے پاس کرنے پر)

کتاب کے آخر میں ''فرد'' کے عنوان کے تحت یک جا کئے گئے اشعار بھی شاعر کے مرکزی تجربے سے جڑے ہوئے ہیں:

عشق کو کھیل سمجھتا ہے زمانہ آنسؔ
ہے یہی بندے کو خالق سے ملانے والا

رات کو جب بھی مری چاند پہ جاتی ہے نظر
اُن کے معصوم سے چہرے کا خیال آتا ہے

ابر چھایا ہوا ہے چاروں اور
چاند نکلے تو کس طرح نکلے

''عشق مری انتہا'' کی زیادہ تر نظمیں واقعاتی تناظر میں لکھی گئی ہیں۔شاعر جس واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہے۔وہ پوری طرح قاری کی گرفت میں آجاتا ہے۔ان نظموں میں آنسؔ صاحب کے سوچنے اور محسوس کرنے کا ایک مخصوص رنگ ظاہر ہوا ہے جو اُن کی باطنی دنیا کا مظہر ہے۔اور یہ رنگ اُن کی غزلوں کی نسبت نظموں میں زیادہ آب وتاب کے ساتھ

جھلکتا ہے۔اُن کے شعری اسلوب کا نمایاں وصف سادگی اور سچائی ہے۔وہ جو کچھ سوچتے اور محسوس کرتے ہیں اُسے مانوس اور موزوں الفاظ کے ذریعے بیان کر دیتے ہیں جس سے اُن کا اسلوب بول چال کی زبان کے قریب رہتا ہے۔اسلوب کا یہ انداز اُن کی تہذیب نفس کا غماز ہے۔اوراسے سہل ممتنع کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

اس شعری مجموعے کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ شاعری محبت، خلوص، ہمدردی، ایثار اور وفا کے اجزا سے متشکل ہوئی ہے۔اس میں رازِ ہستی کو سمجھنے اور بلندیوں کو چھونے کی سعی ملتی ہے اور یہ فرد کی ہمت، جرات، غیرت اور جذبۂ تعمیر کو بھی تحریک دیتی ہے۔اس کے مطالعے سے برتر سطح پر زندگی گزارنے کا فن سیکھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر یٰسین آفاقی

اسلام آباد ماڈل کالج برائے طلبہ

F-8/4 اسلام آباد

مرکزِ دیں مصطفیٰ ﷺ کو ذات کا محور بنا

ماسوا اس راہ کے ہے بولہب کی پیروی

غزل

تن من دھن سب تجھ پہ واروں
پھر بھی سکھی میں چین نہ پاؤں

تیری خاطر دُکھ میں جھیلوں
جینے کا تب لطف اٹھاؤں

تجھ بن میرا جینا مشکل
تیرے بنا میں کس در جاؤں

منگتا ہوں میں تیرے دَر کا
خوش ہوں چاہے پتھر کھاؤں

گاتی ہے دُنیا گیت ملن کے
رنج و الم کے گیت میں گاؤں

کاش تو میرا میں تیرا ہوں
بامعنی آنِسؔ بَن جاؤں

جفا چاہتا ہوں جفا کر رہے ہیں
مجسم وفا ہیں وفا کر رہے ہیں

میں یہ کیوں نہ سمجھوں کہ جلتے ہیں واعظ
میری صحت کی وہ دعا کر رہے ہیں

حذاقت طبیبوں کی کیا ہو گئی ہے
یہ نادان اب بھی دوا کر رہے ہیں

نہ جانے یہ کِس طور کی بے خودی ہے
کھڑے اُن کی راہ میں صدا کر رہے ہیں

چُھپاتے تھے اُلفت مگر آج آنِسؔ
غزل میں سنا کر رَوَا کر رہے ہیں

کیا ہوا کیوں ایک دم یہ اُڑ گیا
میرے رَخشِ عشق پر سایا یہ کس کا پڑ گیا

سَر کو زانوئے تفکر پر جھکایا جب کبھی
خود ستائی کا مجھے ہلکا سا طعنہ جڑ گیا

عشق کا لبریز پیمانہ ذرا چھلکا نہیں
ہاتھ چھلنی ہو گئے کیا سر گیا کیا دھڑ گیا

شاعروں نے زلف کو باندھا ہے پر کمزور سا
زلف نے کچھ ایسا باندھا رنگ پیلا پڑ گیا

بے خودی کا دعویٰ ہے تو کیسے پہچانا ہمیں
وہ تو اتنا کہہ گئے آنِسؔ زمیں میں گڑ گیا

صاف گوئی کے تو یہ معنی چلا کرتے نہیں
بَرملا کہتے پھرو کہ ہم بھلا کرتے نہیں

ہجر کے آلام سن کے ہم سے فرمانے لگے
چاہنے والے ایسی باتیں برملا کرتے نہیں

میرے دشمن سے ملے اور مجھ سے اتنا کہہ گئے
یوں ذرا سی بات پر ہم تو جلا کرتے نہیں

اُن کا اظہارِ تاسف کہہ رہا تھا صاف صاف
ہم کسی کے زخم پر مرہم ملا کرتے نہیں

اُن سے کرتے ہو اے آنِسؔ تم وفا کی آرزو
جو کسی کے ساتھ اک منزل چلا کرتے نہیں

ہر اک اچھی بری ہم نے سہی ہے
مگر اب ہم سے ہی پہلو تہی ہے

خرد کے مشورے یہ کہہ کے ٹالے
کہ تو دیوانگی میں بک رہی ہے

ہو کیوں اُن پر عیاں میری محبت
محبت تو دکھاوے سے تہی ہے

نہ کہنا حال دِل اُن سے خدا را
خرد دیوانی باتیں کر رہی ہے

میرے دِل کی لگن خود کھینچ لے گی
صلح کی بات تم نے کیا کہی ہے

بہت ترک تعلق کر کے دیکھا
مگر عرصے سے عادت تو وہی ہے

اگر مائل نہ ہو پائے کرم پر
یہ تیرے اُنس کی آزمائش نہی ہے

ان کو واعظ بنا دیا تو نے
آہ واعظ یہ کیا کیا تو نے

میں نے کب تیرا کچھ بگاڑا تھا
کب کا بدلا ہے یوں لیا تو نے

ہر قدم پر مجھے ڈراتے ہیں
جانے کیا کچھ پڑھا دیا تو نے

کون سا کام ہو گا اے واعظ
جو کیا ہو گا بے ریا تو نے

تیری باتوں میں آئے گا آنسؔ
جامِ الفت نہیں پیا تو نے

آغاز محبت کا انجام خدا جانے
ہوں گے یا نہیں ہوں گے وہ رام خدا جانے

یہ زندگی میری تو اس دل ہی پہ قائم تھی
کیا جانیے کیا لیں گے وہ کام خدا جانے

ہم لے تو چلے دل کو دربار محبت میں
اَب دیکھیے کیا دیں گے وہ دام خدا جانے

میں نے ہے انہیں چاہا اُن کا ہی بھلا چاہا
کرتے ہیں مجھے کیوں وہ دُشنام خدا جانے

الفت میں سدا اُن کی مدہوش سا رہتا ہوں
گردش میں ہیں پھر کیوں اَب یہ جام خدا جانے

آتے ہیں نہ جاتے ہیں نہ بات ہی سُنتے ہیں
کیوں بیٹھا ہوں راہوں میں سرِ شام خدا جانے

گھر بھر میں سبھی یوں تو آنِسؔ مجھے کہتے ہیں
دیکھیں وہ ہیں دیتے کیا اب نام خدا جانے

شمع چاہے لاکھ بدلے اپنے افسانے کا نام
پائے گا شہرت مگر ہر طرح پروانے کا نام

باخدا مدہوش ہوں خیالِ رُخ جاناں کیے
کیوں غلط بدنام کرتے ہو یوں پیمانے کا نام

ناصحا ان کو بھی سمجھا کچھ خبر بھی ہے اُنہیں
لوگ کیا کیا رکھ رہے ہیں اُن کے دیوانے کا نام

آئیں گے اربابِ الفت در پہ تیرے ہر طرح
چاہے ویرانہ ہی رکھ لے اپنے کاشانے کا نام

لام نستعلیق کا ہے اور کبھی یہ ناگ ہے
ہر ادا پر اک نیا ہے زلف لہرانے کا نام

دُنیا والے ہر قدم پر دیتے ہیں اک غم نیا
ہو گیا مشہور ناحق اُن سے دُکھ پانے کا نام

یہ تو تم آئنس سے پوچھو وہ ہیں کب کس کے ہوئے
کیوں ذرا سی بات کو دیتے ہو یارانے کا نام

ستم ایجاد نے ہم پر بہت ہی ظلم ڈھائے ہیں
کبھی ہنس کر جلایا ہے کبھی غمزے دِکھائے ہیں

خُدا جانے کہ اُس صورت میں یہ اعجاز ہے کیسا
سمجھتے بوجھتے ہم راہ میں آنکھیں بچھائے ہیں

سُنا ہے مضطرب انساں پسند ہے شوخ سیرت کو
اسی جذبہ سے ہم نے دِل جگر اپنے جلائے ہیں

گرفتارِ بلا ہو کر تماشا بن گئے ہم بھی
ہمارے چارسو ناصح ہمیں سمجھانے آئے ہیں

سمجھتا ہوں مری الفت ہے معراج محبت تک
سمجھ سکتا نہیں پھر بھی وہ کیوں پہلو بچائے ہیں

بہت سمجھایا بہلایا بہت بہکایا الفت سے
مگر جذبات دِل ہم کو اُسی محفل میں لائے ہیں

ہم اُن کے دِل میں اپنی حیثیت پہچان کر آنس
کبھی حیران ہوتے ہیں کبھی آنسو بہائے ہیں

دلوں کے راز ظاہر ہوتے ہیں آنے بہانے سے
بھلا اب تک چھپا ہے حالِ دل کس کا چھپانے سے

عنایت کر کے وہ ظاہر ہمیں تڑپانا چاہتے ہیں
ہمیں کچھ یہ ہی اندازہ ہوا ہے ان کے آنے سے

خدا را مان بھی جاؤ نہ میری جان سے کھیلو
بھلا ہو فائدہ کیا ہے کسی کا دل جلانے سے

ترے کوچے میں ہر چھوٹا بڑا ہم کو پکارے ہے
مراسم بڑھ گئے اپنے غمِ دوراں کے کھانے سے

ہر اک آنسؔ سے پوچھے ہے طبعیت کیسی ہے تیری
یہ رُتبہ ہم نے پایا ہے ترے نشتر چلانے سے

مجھ کو بالکل پرسکوں سا آشیانا چاہیے
کوہ کے دامن میں جا کر گھر بسانا چاہیے

میں تو جا پہنچا بہت ہی دور تک اس راہ میں
ناصحو اب تم کو اپنا دل بچانا چاہیے

کب تلک اب ان کے در پہ جا سکو گے اس طرح
دیرپا اور مستقل سا اک بہانا چاہیے

جاؤ نو وارد کو سمجھاؤ کہ یہ راہ ہے، بُری
میری حالت پر فقط اَب دِل بھر آنا چاہیے

رات دن میری کہانی کوئی سنتا ہی رہے
مجھ کو آنسؔ عاشقی کا وہ زمانہ چاہیے

ہماری شومئی قسمت کہ دم ہم اُن کا بھرتے ہیں
کرم عادت نہیں جن کی ستم کرتے میں ڈرتے ہیں

عجب ہی کش مکش میں مبتلا کر ڈالا ہے ہم کو
کہ وہ خوش بھی نہیں ہم سے نہ ہی تیور بدلتے ہیں

رہِ الفت کے ابجد سے ناواقف ہیں یا بے بہرہ
نہ ہی وہ وعدہ کرتے ہیں نہ ہی وعدے سے پھرتے ہیں

ہمیں اُن سے شکایت میں شکایت ہے یہی اِک تو
نہ وہ الزام دَھرتے ہیں نہ ہی احسان کرتے ہیں

ہے یہ اک رازِ سر بستہ جو آنِسؔ پہ نہیں کھلتا
کسی بے حِس سے الفت ہے یا پھر بودم پہ مرتے ہیں

ہر ایک کا حق ہے آنسؔ پر سب لوگ مجھے سمجھاتے ہیں
ان کو بھی تو کچھ سمجھائیں بھلا، یا اُن سے کچھ شرماتے ہیں

کہتے ہیں سبھی غم اپنے بہت، کیوں غیر کا غم تم کھاتے ہو
ہے ان کی جدائی اپنا قلق، کب غیر کا غم ہم کھاتے ہیں

یاں حال ہوا اپنا ابتر، اور صبر کی طاقت ختم ہوئی
غم خوار مگر اب بھی اپنے، حق کہتے ہوئے شرماتے ہیں

حیران ہوں دنیا میں کیسے، انسان کسے اپنا جانے
آنسو جو بہ ظاہر اپنے ہیں بے قابو مجھے کر جاتے ہیں

آدابِ محبت سیکھو نئے، یوں گھٹ گھٹ کر مَر جاؤ گے
جن لوگوں نے یہ فن سیکھ لیا اب اُن کے ہی گُن گاتے ہیں

غم خوار کوئی ایسا ڈھونڈو، اظہار محبت سکھلائے
اَب دَورِ نمائش ہے آیا اب ظاہر پہ سب جاتے ہیں

یہ دَور نیا ہے آنسؔ جی، اندازِ محبت بھی ہیں جُدا
تم ایسے پُرانی راہ والے اُس بزم میں کب راہ پاتے ہیں

تُو سزا دے جو مجھے جُرم یہ تیرا بھی نہیں
ہو گیا عشق مجھے جرم یہ میرا بھی نہیں

عشق کے کوچے میں فریاد ہے اک کارِ عبث
یہاں منصف تو ہو کیا کوئی کٹہرا بھی نہیں

رہِ الفت میں قدم رکھنا کٹھن ہے اِک تو
اور ستم یہ کہ یہاں کوئی بسیرا بھی نہیں

دو گھڑی اور ٹھہر جاؤ کہ ہے وصل کی شب
صبحِ کاذب ہے ابھی کوئی سویرا بھی نہیں

بے شک اندھیرا تو ہے راہ میں ولیکن آنسؔ
دو قدم چل نہ سکو اتنا اندھیرا بھی نہیں

رونقِ محفل گئے اور ان کے پروانے گئے
بزم اب برہم ہوئی اپنے و بیگانے گئے

اَب جو وہ آئیں تو شاید دیکھ پاؤں گا اُنہیں
خود فراموشی تھی جن سے اب وہ میخانے گئے

تیری الفت کی قسم تجھ پر فدا کر دوں گا جاں
میری الفت ناپنے کے آج پیمانے گئے

باعث صد شرم ہے اب تک رہا ایسا مگن
''مجھ سے پہلے اُس گلی میں میرے افسانے گئے''

امتحاں پر امتحاں تھے سخت مشکل تھی مگر
اِس سے حاصل یہ ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

جن سُروں سے صرف حاصل ہو سکے عیش و طرب
اُن سُروں سے دور ہوں اب اُن سے یارانے گئے

کاش وہ مجھ سے کہیں لو دیکھ تم بھی بہار
خاک اُڑتی تھی جہاں غم کی وہ ویرانے گئے

دیکھتا تھا، دیکھتا ہوں، دیکھتا ہی رہ گیا
آئے وہ انجان بن کر اور انجانے گئے

کیا پتا تم پوچھتے پھرتے ہو آنِسؔ کا یہاں
عیش کی میت کو وہ تو آج دفنانے گئے

سُنانے جھوٹے فسانے کہاں کہاں نہ گئے
رقیب تیر چلانے کہاں کہاں نہ گئے

جو حالِ دل نہ چھپے اس میں ہم سے کیا شکوہ
ہم اپنا حال چُھپانے کہاں کہاں نہ گئے

یقین نہ آیا نہ آنا تھا دُنیا والوں کو
دلِ فگار دکھانے کہاں کہاں نہ گئے

تھا نیم کُشتہ کوئی تو کوئی تھا کشتۂ جاں
وہ اپنا رنگ جمانے کہاں کہاں نہ گئے

تمہارا دل نہ کسی طور بچ سکا آنسؔ
تم اپنے دل کو بچانے کہاں کہاں نہ گئے

ہمیں اُن سے محبت ہے اُن ہی کے گیت گائیں گے
کہاں تک ظلم ڈھائیں گے بالآخر مان جائیں گے

رقیبو!، ناصحو!، شیخو! نہ چھیڑو واعظو! ہم کو
یہ سب وعظ و نصیحت سن کے ہم ان کے کہائیں گے

اگر آئیں تو اب آئیں نہ آئیں پھر نہیں آئیں
کہاں ہم اُن کو پائیں گے کہاں وہ ہم کو پائیں گے

شبِ وعدہ نہ وہ آئے تو یوں آہیں بھریں ہم نے
کہ جیسے تھا یقیں ہم کو وہ سچ مُچ آ ہی جائیں گے

بہت حضرت ہیں یہ حضرت کہ ہیں یہ حضرتِ آنسؔ
ارے حضرت انہیں چھوڑیں انہیں اب کیا سکھائیں گے

تم تو روٹھے ہی خوب لگتے ہو
میں مناؤں تمہیں خدا نہ کرے

تم چُھپا ہی کرو تو اچھا ہے
میں ہوں مدہوش یہ خدا نہ کرے

تیرے دیدار کی اُمید رکھوں
مجھ سے یہ امتحاں خدا نہ کرے

میں بھی پہنچوں تمہاری محفل میں
یہ دعا میں کروں خدا نہ کرے

''بات پر واں زبان کٹتی ہے''
میں یہ مُنہ کہوں خدا نہ کرے

کہاں وہ اور کہاں حقیر فقیر
مجھ سے یہ امتحاں خدا نہ کرے

ترے دل میں جگہ نہ میری
ایسا ظالم تجھے خدا نہ کرے

تو نے کچھ ہے مزا چکھا آنسؔ
ورنہ تو یوں خُدا خُدا نہ کرے

(بے قافیہ غزل)

کیا لکھوں حال پریشاں آج کل
ہے زمانہ مجھ سے نالاں آج کل

ہو گیا ہے قافیہ تنگ اس قدر
ہے غزل بے قافیہ ہی آج کل

امتحاں پر امتحاں ہیں آج کل
پوری ہوتی ہی نہیں یہ آج کل

وصل کی صورت نکلتی ہی نہیں
کر رہے ہیں آج کل اور آج کل

میری الفت پر ہیں وہ مجھ سے خفا
رنجشیں ہیں کیسی کیسی آج کل

ہر نفس ہے ابتلا میں مُبتلا
رنگ محفل کا ہے پھیکا آج کل

کہتے تھے جس کو خلوصِ دِل کبھی
قدر اس کی کچھ نہیں ہے آج کل

آؤ صحرا میں ہوں گوشہ گیر اَب
شہر کی تو زندگی شرمندگی ہے آج کل

کوئی بھی سنتا نہیں بپتا میری
ہر طرف ہے نفسی نفسی آج کل

کیسا یہ دور جنونِ شاعری
ہو گیا کیا تم کو آنِسؔ آج کل

(بے قافیہ غزل)

نظم

مدح درخدمت جناب علی خان صاحب
وائس چانسلر پشاور یونی ورسٹی ۱۹۷۵ء

نوٹ: شیر پاؤ قتل کیس سے کچھ عرصہ قبل علی خان صاحب نے ہم طلبا میں سے کئی کو یونی ورسٹی سے نکال دیا تھا، چنانچہ ہم یہ معاملہ ہائی کورٹ میں لے گئے اور وہاں سے جب ہم جیت کر آئے اُس وقت شیر پاؤ کے قتل کے سبب علی خان صاحب کے خلاف احتجاج ہوا اور انہیں فوراً یونی ورسٹی سے چلا جانا پڑا ورنہ ان کا دعویٰ تھا جب تک میں ہوں یہ طلبا یونی ورسٹی میں نہیں آسکتے۔

کوئی تو اس سے جذبۂ الفت دکھائے بھی
کوئی تو اُس کی یاد میں آنسو بہائے بھی

آ میں ہی تجھ کو یاد کروں اے ستم ظریف
یوں بھی تو تجھ سے پہلے کئی غم ہیں کھائے بھی

ہم جیسے کتنے لوگوں پہ نظرِ کرم رکھی
اِن خوبیوں کے آپ نے انعام پائے بھی

چاہتے تھے ہو نصاب سے ہٹ کے بھی تربیت
ہم کو عدالتوں کے ہیں رستے دکھائے بھی

دو ماہ بھی لگے نہیں کل دُوڑ دھوپ میں
اتنے قلیل وقت میں نکلے بھی آئے بھی

کہتے تھے ہم رہیں گے یہاں یا رہو گے تم
قربان جاؤں ایسی زباں کوئی لائے بھی

گر سچ کہوں تو ہم کو بہت تو عزیز تھا
پر کیا ضرور تھا کہ ہمیں تو ستائے بھی

کس دھوم دھام سے ہے کیا تم کو الوداع
سچ کہنا ہم تمہیں ہیں کبھی یاد آئے بھی

آنِسؔ مزا تو جب ہے علی خان کے حضور
اِس منقبت کو جا کے تو خود ہی سنائے بھی

میر ببر علی انیس کی صد سالہ برسی پر

(1 دسمبر ۱۹۷۴)

جب خلاف اردو کے کوئی بات ہو سُن پائے تم
اپنے دِل میں دیر تک ہو کس قدر جھنجھلائے تم

خانداں کی بھی تمہارے مستند مانی زباں
اِس زباں کے حق میں خالق کا کرم کہلائے تم

تم وہ گل ہو جو کِھلا رہنے کو ہے پیدا ہوا
اک صدی کے بیت جانے پر نہیں مرجھائے تم

بگڑا شاعر مرثیہ گو دُنیا والوں نے کہا
تم نے یہ سب کچھ سنا لیکن نہیں گھبرائے تم

مرثیہ کہنا بہ ظاہر اک خزاں کا ذکر ہے
اِس خزاں میں بھی و لیکن خوب ہو لہرائے تم

جب زباں خستہ ہوئی مجروح ہوئی عاجز ہوئی
اے انیس و محسنِ اردو بہت یاد آئے تم

آج آنِسؔ ہو ثنا خوان انیس و میر تم
ان کی اردو کو بگاڑا اور نہیں شرمائے تم

مارشل لاء کے بعد

سنبھل اے قوم اب تیرے لیے وقت سحر آیا
بڑی مشکل، بڑی مشکل، بڑی مشکل سے پر آیا

بہت کھویا بہت قربانیوں کے بعد ہے آیا
مگر آیا، مگر آیا ، مگر آیا، مگر آیا

ابھی ہیں امتحاں باقی ابھی تکلیف باقی ہے
فقط جمہوریت کا ہے ابھی تو در نظر آیا

عمل پیہم ہے یوں کرنا کہ رہ جائے عدو ششدر
جہادِ فی سبیلِ اللہ ہے کرنا وقت گر آیا

ہمیں یہ عہد کرنا ہے رہیں گے بھائی چارے سے
سنبھالیں گے اس کشتی کو اگر کوئی بھنور آیا

نہ آئے سرحدوں کوئی بھی اعلان کر آنِسؔ
نہ جائے گا کبھی بچ کر زبردستی اگر آیا

حضرتِ دل

نجانے حضرتِ دل نے طبیعت کس کی پائی ہے
ہوئے ہیں کس کے یہ شیدا ادا یہ کس کی بھائی ہے

نہ اُن کے ہیں نہ میرے ہیں خدا جانے یہ کس کے ہیں
ادائیں ان کی بھائی ہیں نگاہ مجھ پہ جمائی ہے

بظاہر قطرۂ خوں ہیں بباطن ایک طوفان ہیں
نہایت مختصر سے ہیں مگر ہل چل مچائی ہے

ابھی پہنچے ثریا تک ابھی تحت الثریٰ میں ہیں
میں حیراں ہوں طبیعت کس قدر سیماب پائی ہے

یہی خالق کے مداح ہیں یہی مخلوق کے عاشق
مرے بھی دل کی دھڑکن ہیں عجب یہ دل ربائی ہے

عجب تنظیم ہے ان کی عجب بارعب حاکم ہیں
جو یہ دھڑکیں تو زندہ ہیں وگرنہ موت آئی ہے

گزشتہ شب اچانک شوق اٹھا خود ستائی کا
نہ خود سوئے نہ مجھ کو ایک پل کو نیند آئی ہے

ذرا تم ہی سناؤ سوانح حضرتِ دل کو
میں خود جا کر سنا آتا مگر مجھ سے لڑائی ہے

یہ جو کچھ بھی ہیں اے آنس مگر بے باک فطرت ہے
جہاں پہ عقل رک جائے وہاں ان کی رسائی ہے

مفلس کے لیے خوشی کا دن

کوئی تہنیت اور کوئی ہار لائے
مٹھائی کی خاطر کوئی چل کے آئے

کوئی آ کے مفلس کو یہ بھی بتائے
تہی دامنی کو وہ کیوں کر چھپائے

عجب طور دنیا کا یہ ہو گیا ہے
ہر اک اپنا اپنا ہی غم کھائے جائے

غریبوں کے مخلص رہے خال خال
وگرنہ ہر اک ان پہ باتیں بنائے

یہ حساس ہے گھٹ کے مر ہی نہ جائے
خدا را نہ اب اس کو کوئی ستائے

یہ مجبور ہے ورنہ ایسا نہیں ہے
کہ مہماں کے آنے سے گھبرا ہی جائے

یقیناً وہ مفلس خلش میں رہے گا
خوشی بھی جو ادھار لے لے کے پائے

میں مجبور اس کو ہی کہتا ہوں ہم دم
خوشی کا جو اظہار تک کر نہ پائے

وہاں کیسے بارانِ راحت ہو آنِسؔ
جہاں ابرِ افلاس ہر سمت چھائے

اے فن کار

صنم صنم کے یہ اشعار اب قدیم ہوئے
کہ قیدِ فکرِ جہاں میں سبھی ندیم ہوئے

ہو کس کی راہ میں اَب یاں سے کون جائے گا
معاش چھوڑ کے جلوہ دکھانے آئے گا

اگر ہے ہوش تو اب ہوش کی کرو باتیں
نشاط و عیش کی اَب تو گزر گئیں راتیں

اگر قلم میں ہے طاقت تو قوم سے یہ کہے
بہم ملاپ سے یک جا خلوصِ دل سے رہے

خُدایا ہاتھوں میں طاقت تو اس قدر بھر دے
جھنجھوڑ کر جو دماغوں کو مضطرب کر دے

اگر زبان ہے کچھ آشنا خطابت سے
تو روشناس کراؤ اسے لطافت سے

یہ آنکھ روئے جو مسلم رہے یوں ہی خستہ
مگر کمر رہے اصلاح پر کمر بستہ

یہی وہ کام ہے آنس جو کام آئے گا
اسی سے دنیا میں اونچا مقام پائے گا

اعتماد

اعتماد اے اعتماد اے اعتماد اے اعتماد
اِک نہ ہونے سے ترے برپا ہوا کتنا فساد
ماتحت کہتا ہے میرا جینا دُو بھر ہو گیا
باس میرا اوچھے ہتھکنڈوں سے افسر ہو گیا
اس کو آتا کچھ نہیں ہے کرتا ہے جو جی کرے
روکے ہے میری ترقی اور سازش بھی کرے
یہ اکڑ یہ رعب دیکھو تو ذرا یہ کون ہے
بیٹھا ہے کرسی پہ یوں گویا یہی فرعون ہے

اور افسر سے ملو تو کہتا ہے کاہل ہیں یہ
بات کرنے کا سلیقہ تک نہیں جاہل ہیں یہ
دیر سے دفتر کیوں آئے پوچھ بیٹھا جو حضور
بَس یہ سمجھیں کر دیا میں نے بہت گھٹیا قصور
اور اگر خوش گپیوں میں ہو گیا ان کی مخل
پھر نہ پوچھیں کس طرح چیریں گے یہ میرا یہ دل
اعتماد اے اعتماد اے اعتماد اے اعتماد
اِک نہ ہونے سے ترے برپا ہوا کتنا فساد

گر ملو مزدور سے کہتا ہے میں تو مر گیا
زر پرستوں کا شکنجہ مجھ کو بے بس کر گیا
رات دن محنت کروں اور حق مجھے ملتا نہیں
چاک ہے میرا گریباں جو کبھی سلتا نہیں
میرے بونس تک کو کھا جاتا ہے یہ سرمایہ دار
حق غریبوں کا ہے کھاتا اور نہیں احساسِ عار
اس کے برعکس اہل زر کہتے ہیں یہ بے شرم ہیں

باوجود اس کے ہم ان کے حق میں اب بھی نرم ہیں
حق ہمارا کھاتے ہیں اور کرتے ہیں ہڑتال بھی
جز پریشانی نہ آیا ہاتھ کچھ اِمسال بھی
اِس پہ طُرّہ یہ کہ ہم کو کہتا ہے یہ نابکار
جو بڑا ڈاکو ہے بَس وہ ہی تو ہے سرمایا دار
اعتماد اے اعتماد اے اعتماد اے اعتماد
اِک نہ ہونے سے ترے برپا ہوا کتنا فساد

اک طرف ہیں جھگڑا کرتے گاہک و دکاندار
تیرے نہ ہونے سے سب کے سب ہیں مشکل سے دوچار
مجھ کو تاجر لوٹتا ہے، ہے یہ گاہک کا خیال
بس نہیں چلتا نہ چھوڑے میرے سر پر ایک بال
دُگنی تگنی قیمتیں ہم سے یہ کرتا ہے وصول
جو کچھ اس کے منہ سے نکلے وہ بس اس کا اصول
کہتا ہے تاجر کہ گاہک میری سنتا ہی نہیں
کہتا ہوں جو کچھ میں اس کو سچ سمجھتا ہی نہیں

اکثر اس کے ذہن میں آتا ہے ایسا بھی خیال
سستی اشیا اس کو دے کر چل رہا ہوں کوئی چال
یا تو یہ ناکارہ شے ہے یا وزن اِس کا ہے کم
سوچتا ہے سوچتا ہے اور بڑھاتا ہے قدم
اعتماد اے اعتماد اے اعتماد اے اعتماد
اِک نہ ہونے سے ترے برپا ہوا کتنا فساد

اور سیاست میں تو حد درجہ ترا فقدان ہے
فکر ہے لیڈر کو کب تک باقی میری شان ہے
ایک دن اچھا گزر جائے غنیمت جانیے
کارکُن کو اپنے اچھی طرح سے پہچانیے
کیا خبر یہ کارکُن ہی کل عذابِ جاں بنے
اور نوبت آئے ایسی کہ یہ چبوائے چنے
کارکن بھی رکھتا ہے لیڈر پہ تنقیدی نگاہ
کل اسے گر میرے باعثِ مل گئی عزت و جاہ

ہاتھ جس جا بھی یہ مارے گا خود ہی کھا جائے گا
ہم نوا تو اِس کا ہونے کا صلہ کیا پائے گا
الغرض ہر شعبے میں تیری کمی سے ہے فساد
اعتماد اے اعتماد اے اعتماد اے اعتماد

خطرہ پھر تصدیق یا تردید

کسی جانب بھری محفل میں گر تیری نظر اُٹھے
پھر اٹھے تو ادھر اُٹھے پھر اُٹھے تو اُدھر اُٹھے

اگر ایسا کبھی ہو تو یہ فوراً جان لینا ہے
وہ دِل میں آن پہنچا ہے نگاہوں کے دریچے سے

جو پھر تصدیق چاہو تو ذرا دل پر نظر کرنا
خشوعِ قلب سے اس پر تم اپنا ہاتھ بھی دھرنا

جو یہ بے ڈھب دھڑکتا ہو تو خطرہ جان لو اَب کچھ
سکونِ قلب حاصل ہو تو جانو ٹھیک ہے سب کچھ

یہی پیمانہ ہے آنِسؔ جو بالکل سچ بتاتا ہے
وگرنہ اول اول تو ہر اک حالت چھُپاتا ہے

کیمرہ

ہماری ہر خوشی غم اور راحت اس سے ظاہر ہے
یہ فوٹو بھی عجب شے ہے ذہانت اس سے ظاہر ہے

ہماری ناک کیسی ہے ہمارے کان کیسے ہیں
بتا دیتا ہے سب ہم کو ہم ایسے ہیں یا ویسے ہیں

ہمیں یہ گزرے وقتوں کے وہ پہلو بھی بتاتا ہے
کہ جن کے جاننے سے دِل ہمارا جھوم جاتا ہے

نگاہ کے سامنے ایسے مناظر بھی یہ لاتا ہے
کہ اِنساں دیکھتے ہی شرم سے آنکھیں جھکاتا ہے

بہت نازک سا آلہ ہے مہارت پوری چاہتا ہے
کمی رہ جائے تو ہنستوں کو بھی روتا دکھاتا ہے

بہت خوبی ہے پَر اس میں یہ اِک پہلوئے عصیاں ہے
اور اک خامی تو یہ بھی ہے کہ یہ ایجادِ انساں ہے

نیگٹیو اس کا کام آتا ہے اکثر چال بازی میں
بہت ہی کام کی شے ہے یہ فنِ جعل سازی میں

پٹھان

دیکھو اسے پٹھان یہی تھا
قوم کی سچی آن یہی تھا

سُرخ و سپید جری و سادہ
حق کی خاطر تھا اِستادہ

کوئی نہ تھا اِس قوم کا ثانی
بے باکی تھی اس کی نشانی

دین پہ محکم اس کا یقیں تھا
اِس جیسا اور کوئی نہیں تھا

صفت تھی اِس کی مہمان داری
جان تھی اِس کی آن پہ واری

پابندِ صوم صلوٰۃ یہی تھا
کرتا پکی بات یہی تھا

نہ جانے انگریز نے آکر
کھوکھلی عزت اس کو دکھا کر

کیسے اس کو لوٹ لیا ہے
حیراں ہوں کیا اس کو دیا ہے

ایسی عادت میں الجھایا
چرس کا اس کو رسیا بنایا

آپس میں لڑتا مَرتا ہے
ہر اک سے دنگا کرتا ہے

صحت کو اپنی گُھن ہے لگایا
سب کچھ کھو کر کچھ نہیں پایا

یا اللہ میری یہ دعا ہے
کون عنایت میں تجھ سا ہے

اس کو وہ اوصاف عطا کر
جو کہ ہم دُنیا کو دکھا کر

کہہ سکتے ہوں فخر سے ایسا
پٹھان ہے اب پھر بالکل ویسا

عزم مسلّم مُسلِم جیسا
خوشیوں کا ہے یہ سندیسا

شاعر

دل میں آتش لگاتا ہے شاعر
خود ہی اِس کو بجھاتا ہے شاعر
کبھی یہ ہے خودی کو کرتا بلند
کبھی بے خود بناتا ہے شاعر
کچھ عجب چیز ہوتا ہے شاعر

اس کو نازو ادا سکھاتا ہے
انکساری پہ خود کو لاتا ہے
اس میں خوبی ہے کیا نہیں معلوم
اتنا عُنقا اُسے بناتا ہے
کچھ عجب چیز ہوتا ہے شاعر

کرنا چاہتا ہے ہر طرح قائل
بن کے سائل کبھی کبھی گھائل
ہر طرح کے جتن جو کرتا ہے
کر ہی لیتا ہے کچھ اُسے مائل
کچھ عجب چیز ہوتا ہے شاعر

جب کسی سے یہ دل لگاتا ہے
ایسے الفاظ کو مِلاتا ہے
گُل و بُلبُل کا جیسے رشتہ ہو
اپنی الفت کو یوں جتاتا ہے
کچھ عجب چیز ہوتا ہے شاعر

ذوقِ اشعار جب سوار ہو تو
بے رُخی اُس کی ناگوار ہو تو
کیا عجب ایسے وقت میں آنسؔ
چھڑ گیا میرے دِل کا تار ہو تو
کچھ عجب چیز ہوتا ہے شاعر

کاروبارِ عشق

جس نے دیکھا کبھی کاروبار درویشوں کا
اُس نے آنکھوں سے دیکھا ہے وقار درویشوں کا

پورے جگ میں نہیں کوئی اس کی مثال
گرم ہے ایسا دیکھو بازار درویشوں کا

اسی راہ سے خُدا کے رسول ملے
یہی رستہ ہے عالی تبار درویشوں کا

بات ان کی خدا کو بھی مقبول ہے
کر قبول تو بھی طرزِ گفتار درویشوں کا

پہنچے ہیں عرش تک اِک قدم میں یہ لوگ
میں نے دیکھا اندازِ رفتار درویشوں کا

بادشاہ خاک کی مثل دَر پہ پڑے
ایسا ذی شاں ہے دیکھو دربار درویشوں کا

ترکِ دنیا بھی ہے یاں خدا کے لئے
رحمت، رحمت ہے رحمت روزگار درویشوں کا

ہر بہار پہ لازم ہے بے شک خزاں
پر ہے گلشن سدا بہار درویشوں کا

سارا دیواں ہے رحمٰن اس پہ فدا
اِس غزل میں بیاں ہے کردار درویشوں کا

(رحمٰن بابا کے کلام سے ماخوذ)

مے کدے کی رات

ڈھول باجے بجے جو وہ آیا
دھن دھنا دھن دھنن دھنن دھن دھن

رات بھر مے کدہ رہا آباد
چھن چھنا چھن چھنن چھنن چھن چھن

رقص میں تھا ہر ایک مستانہ
جھن جھنا جھنن جھنن جھن جھن

صدقہ کرنے کے سِکّے یوں برسے
کھن کھنا کھن کھنن کھنن کھن کھن

بج رہی تھی دلوں میں موسیقی
تن تنا تن تنن تنن تن تن
ناگہاں صبح کی بجی گھنٹی
ٹن ٹنا ٹن ٹنن ٹنن ٹن ٹن

اندر کی جیب

لوگ باہر کی جیب میں اکثر
ایسی چیزیں ہی رکھا کرتے ہیں

جو نظر آئیں جیب میں رکھی
جو نمائش کے کام آتی ہیں

جو بظاہر تو قیمتی ہیں مگر
ان کے کھونے کا غم بھی کم کم ہو

یہ مرا دل ہے قیمتی شے ہے
میرے جذبِ دلی کا مظہر ہے

میں تمہیں دے رہا ہوں نذرانہ
دل کی اندر کی جیب میں رکھنا

وقت نازک ہے لوگ ڈاکو ہیں
لے اُڑیں گے تو تم کو دکھ ہو گا

اور تم سے بھی کچھ زیادہ ہی
اس کے کھونے کا مجھ کو غم ہو گا

میں نہیں چاہوں گا کسی صورت
تم دکھی ہو یا میں فسردہ ہوں

روشنی کی کرن

تازگی، ہریالی، شادابی چمن اندر چمن
جھلملائی ارضِ پاکستان میں روشن کرن

سایہ لطفِ بنی ہے مہرباں ہے ذوالمنن
بڑھ رہی ہے عالمی اقوام میں اس کی پھبن

سوئے پاکستان ہے ہر دم رواں فصلِ بہار
دِل میں پاکستانیوں کے ہیں اُمیدیں موج زن

بڑھ رہا ہے اتفاق و اتحاد و اعتماد
مِٹ رہے گا کچھ دنوں میں قلب کا سوزِ کہن

اس کے بچے، اس کے بوڑھے اور سارے مرد و زن
اس کی خوش حالی کی خاطر وار دیں گے جان و تن

ظلمتیں روکیں گی کب تک روشنی کا قافلہ
جذبِ دل عزم جواں سے مہکے گی یہ انجمن

نفرتیں، افلاس غربت ڈھونڈیں گی راہِ فرار
الفتوں کا راج ہوگا چھائے گا ہر سو امن

روشنی ، تابندگی اب کارواں در کارواں
ہو رہی ہے میری ماں دھرتی پہ آ کے خیمہ زن

جب عمل اخلاص کا جاری رہے گا دیکھنا
جگمگا اٹھے گا اِک دن زندگی کا پیرہن

میرے قائد کی مسلسل محنتوں کا ہے ثمر
دیکھنا قائم رہے گا تا ابد میرا وطن

سندھ ہو پنجاب ہو سرحد بلوچستان ہو
اس کے ہر صوبہ سے آئے پیار کی مشکِ ختن

خشک سالی کے لیے ایک نظم

اے خداوندِ جہاں کیا ہو گیا
ہے گناہ گاروں سے کیوں اتنا خفا
ہم تو اک عرصہ سے ہیں غافل یوں ہی
پستیوں کی سمت ہیں بڑھتے ہوئے
غفلتیں کچھ آج کل کی تو نہیں
کم سے کم ہے دو صدی کا یہ سفر
اے خداوندِ جہاں کیا ہو گیا
بارشیں اب کیوں نہیں ہیں ہو رہیں

ایک عرصہ سے ہیں ہم ترسے ہوئے
کھیت اور باغات بنجر ہو گئے
اور مویشی بھوک سے ہیں مر رہے
نہر اور دریا ہیں یوں سوکھے ہوئے
نہریں دریا ندی نالے بن گئے
کیوں پہاڑوں پر برف پڑتی نہیں
کیوں پہاڑی آبشاریں خشک ہیں
اے خداوندِ جہاں کیا ہو گیا
کیا جہان آب و گل سے ایک دم
تیرے وہ سب نیک بندے اٹھ گئے
جن کے صدقے درگزر کرتا رہا
جن کے صدقے بارشیں کرتا رہا
جن کے صدقے یہ زمین زرخیز تھی
جن کے صدقے کھیت یہ آباد تھے
جن کے صدقے ہر کرم کرتا رہا
اے خداوندِ جہاں کیا ہو گیا

کیا زمیں پر سب سے تو ناراض ہے
تو اگر روٹھا تو کیا رہ جائے گا
اے خداوندِ جہاں ایسا نہ کر
نام لیوا اب بھی ہیں اس دیس میں
اور پھر ہے تو تو رب العالمین
ان پرندوں کا تو پالن ہار ہے
یہ شجر بھی کرتے ہیں تیری ثنا
ہم گناہ گاروں کا بھی رب ہے تو ہی
دے ہمیں توفیق اُن اعمال کی
جن سے بارانِ کرم کرتا ہے تو

کوہِ چاغی

کوہِ چاغی کی ضیا پاشی سے اے ارضِ وطن
ذرہ ذرہ تیری خاکِ پاک کا ہے گل بدن

جس طرف دیکھو مسرت جس طرف دیکھو چمک
نور چاغی سے چمک اُٹھے ہیں سب کوہ و دمن

کوہِ چاغی تجھ سے ہم کو سربلندی مل گئی
ذرہ ذرہ پا گیا ہے نور کا اِک پیرہن

اعتماد اور حوصلے کی مہکی مہکی یہ فضا
اس سے آگے کچھ نہیں لگتی ہمیں مشکِ ختن

تیری کرنیں تیر کی مانند پھیلیں اس طرح
دشمنانِ ملک وملت کے بدل ڈالے چلن

ایک عرصہ تک رہا خلوت نشیں گوشہ نشیں
آج پاکستان کی تو نے سجائی انجمن

سارے پاکستان کو ہے ناز تیری خاک پر
سج گیا نظروں میں اپنی آج تیرا بانکپن

کشمیر جل رہا ہے

رائے دہی کے حق کا وعدہ ہے ٹل رہا ہے
کشمیر جل رہا ہے، کشمیر جل رہا ہے

اقوام مغربی کو دعویٰ ہے منصفی کا
بھارت کا مکر و حیلہ پھر بھی ہے چل رہا ہے

جز اس کے اور کیا ہے، ظلم وستم کا باعث
کشمیریوں کا جذبہ، بھارت کو کھل رہا ہے

بچے ہوں یا کہ بوڑھے اور مرد و زن سب ہی کے
سینے پہ مونگ بھارت، عرصہ سے دَل رہا ہے

جسموں کو ختم کر کے، غاصب کو کیا ملے گا
یہ حریت کا جذبہ، روحوں میں پل رہا ہے

دیکھے گی دنیا جلدی، وہ دن ہے آنے والا
اپنے کیے پہ بھارت، اب ہاتھ مَل رہا ہے

خواب کے دو رُخ

(۱)

خواب خواب ہیں جاناں
خواب کی حقیقت کیا
خواب کی مسرت کیا
لمحہ اک خوشی کا ہے
پیچھے کچھ نہیں رہتا
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
خواب توڑ جاتے ہیں
خواب دیکھنا چھوڑو
یہ فریب دیتے ہیں
مطمئن دلوں کو یہ

دل شکستہ کرتے ہیں
اک سراب کے پیچھے
زندگی گنوانا کیا
زندگی حقیقت ہے
خواب بے حقیقت ہیں
ان کے پیچھے مت بھاگو
ایسا یہ بکھیریں گے
پھر سمٹ نہ پاؤ گے

(۲)

یہ بھی اک حقیقت ہے
خواب اک سہارا ہے
تلخیوں میں جیون کی
حوصلہ بڑھاتے ہیں

خواب دیں سکوں ہم کو
خواب دیں خوشی ہم کو
خواب ہی تو کل جا کر
آج کی حقیقت کا
روپ دھار لیتے ہیں
خواب دیکھنا چھوڑوں
کیسے چھوڑ سکتا ہوں
خواب ہی تو اے جاناں
زندگی بڑھاتے ہیں
جذب دل بڑھاتے ہیں
یہ اساس بنتے ہیں
کل کی کامیابی کی
یہ اگر نہ ہوں جاناں
زندگی بھی رک جائے
زندگی کو حرکت دیں
زندگی کو برکت دیں

دیکھنا تو یہ ہو گا
خواب کس نے دیکھا ہے
بلی خواب دیکھے تو
چھیچھڑے نظر آئیں
بلی ہو جو کھسیانی
صرف کھمبا نوچے ہے
آدمی میں بلی میں
جب کہ فرق ہوتا ہے
لازمی ہے اے جاناں
خواب بھی جدا ہوں گے
آدمی کے خوابوں میں
عقل کا دخل ہوگا
جذبۂ دلی ہو گا
ایسا خواب اے جاناں
حریت کا جذبہ دے
توڑ دے ہے زنجیریں

دے وطن کو آزادی
بیسویں صدی جب کہ
رخصت ہونے والی ہے
دورِ نو کی آمد پر
آج بھی ضرورت ہے
ایسے ایک انسان کی
ایسا خواب جو دیکھے
جس سے متحد کر دے
پھر سے جذبِ دل دے کر
شوق دے عمل کا بھی
ہمتیں جواں کر دے
عزمِ نو عطا کر دے
اے خدا عطا کر دے
صدقہ اپنے پیارے کا
دے یقین کی دولت
اور عمل کا سرمایا

اک خلوص کا پیکر
رہنما عطا کر دے
خاص فضل سے اپنے
خواب کو حقیقت کر
کاش ایسا ہو جاتا
کاش ایسا ہو جائے

(بیادِ اقبال)

موٹروے

ہے موٹر وے تو نام اس کا
یہ شاہراہ ترقی ہے
یہ جتنی چوڑی چکلی ہے
یہ جتنی خوبصورت ہے
اُسی نسبت سے دیکھو گے
خدا نے چاہا تو جلدی
اسی دو رویا شاہراہ سے
ترقی چل کے آئے گی

بنے گی صنعتی بستی
یہ وسطی ایشیا والے
اسی شاہراہ کے رستے
پیروئے جائیں گے ایسے
ہوں جیسے پھول گجرے کے
بہت سی بستیاں ایسی
یہاں پہ بننے والی ہیں
کہ جن کو دیکھ کر یورپ
ترقی بھول جائے گا
میاں صاحب مبارک ہو
رقم وہ باب کر ڈالا
بنے تاریخ کا حصہ
جسے اب رہتی دنیا تک
مٹا سکتا نہیں کوئی
بنے ہو شیر شاہ سوری

رات اور بات

رات اور بات میں ذرا دیکھیں
ظاہراً قافیہ ہی یکساں ہے

دیں توجہ تو یہ عیاں ہو گا
کتنی قدریں ہیں اور بھی یکساں

رات اپنوں کے درمیاں اچھی
بات اپنوں کے درمیاں اچھی

بعض راتوں کو بھولنا چاہیے
بعض باتوں کو بھولنا چاہیے

بعض راتیں ہیں کاٹ کھاتی ہیں
بعض باتیں ہیں کاٹ کھاتی ہیں

کبھی راتوں میں لطف آتا ہے
کبھی باتوں میں لطف آتا ہے

رات بھی زہر لگنے لگتی ہے
بات بھی زہر لگنے لگتی ہے

بعض راتیں طویل ہوتی ہیں
بعض باتیں طویل ہوتی ہیں

رات میں بھی گناہ ہوتا ہے
بات میں بھی گناہ ہوتا ہے

راتیں بھی ہیں ثواب کی حامل
باتیں بھی ہیں ثواب کی حامل

بعض راتوں میں قدر ہوتی ہے
بعض باتوں میں قدر ہوتی ہے

رات بھی عیب پوش ہوتی ہے
بات بھی عیب پوش ہوتی ہے

رات کا انتظار ہوتا ہے
بات کا انتظار ہوتا ہے

کبھی راتوں میں بات ہوتی ہے
کبھی باتوں میں رات ہوتی ہے

کبھی راتوں سے خوف آتا ہے
کبھی باتوں سے خوف آتا ہے

کبھی راتوں کی یاد آتی ہے
کبھی باتوں کی یاد آتی ہے

کبھی راتوں میں گھات ہوتی ہے
کبھی باتوں میں گھات ہوتی ہے

کبھی راتوں میں بے قراری ہو
کبھی باتوں میں بے قراری ہو

بعض راتیں سکون دیتی ہیں
بعض باتیں سکون دیتی ہیں

کہیں راتوں کو کاٹا جاتا ہے
کہیں باتوں کو کاٹا جاتا ہے

رات بھی بار بار ہوتی ہے
بات بھی بار بار ہوتی ہے

گزری راتوں پہ بس نہیں چلتا
گزری باتوں میں بس نہیں چلتا

رات آخر تمام ہوتی ہے
بات آخر تمام ہوتی ہے

عید کے آنے سے پہلے

عید کے آنے سے پہلے ان کے گھر میں عید تھی
اُن کی بچی کہہ رہی تھی اس دفعہ تو عید پر

جھلملاتا نیلا پیلا جوڑا بنواؤں گی میں
اور بچہ کہہ رہا تھا جا کے ہر اک دوست سے

میرے ابا کا ہے وعدہ اس دفعہ تو عید پر
اِک نیا جوتوں کا جوڑا مجھ کو لا دیں گے ضرور

دِن گِنا کرتے رہے بچے تو خوشیوں کے لیے
عید کے آنے سے پہلے گھر میں یرقاں آ گیا

دونوں بچے مبتلا تھے ناگہاں یرقاں میں
باپ کی تنخواہ جتنی ڈاکٹر کی فیس تھی

اور دواؤں کے لئے تو قرض تک لینا پڑا
عید کے دن تن پہ بچوں کے تھا بوسیدہ لباس

روکھی سوکھی عید آئی، روکھی سوکھی ہی گئی
عید کے آنے سے پہلے اُن کے گھر میں عید تھی

کتابِ حیات

یہ آنکھیں ہماری کھلی ہیں اگر
اگر کان میں روئی ٹھونسی نہیں
نہیں ہے دماغوں میں نخوت اگر
اگر دل میں خواہش ہے سیکھیں سبق
ہر اک چیز ہے اِک مجسم کتاب
نہیں ایک بابِ کتابِ حیات

ہر اک کج فہم اک گزشتہ سبق
تو ذی فہم دے ہیں نیا اِک سبق
اگر سختیاں ہیں نصابی کتاب
تو آسانیاں ہم نصابی کتاب
ہر اک لمحہ سمجھو کہ استاد ہے
تو الجھن کو سمجھو کہ ہے ممتحن
ہیں جاری یہاں امتحاں گاہ گاہ
یہ آسودگی اور یہ بے چینیاں
انہی امتحانوں کے ہیں یہ ثمر
اگر چاہتے ہو کہ ہو کامراں
پڑھو غور سے یہ کتاب حیات
اور ہر صفحے سے نوٹ لیتے رہو

بدلتی قدریں

اِک وہ بھی زمانہ تھا کہ اَجداد ہمارے
خود اس پہ عمل کرتے تھے اور کہتے تھے سب سے

نیکی ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
گر چاہو پڑے واسطہ اچھائی سے ہر دم

اچھائی کیے جاؤ جہاں تک ہو جہاں میں
پر آج بدلتی ہوئی قدروں کے سبب سے

ہم کہتے ہیں اور اس پہ عمل بھی ہے ہمارا
گر چاہو کہ محفوظ رہو دنیا کے شر سے

اپنا ہو پرایا، کبھی اچھائی نہ کرنا
گر بات یہیں رہتی تو افسوس تھا پھر بھی

اقدار کی پستی کا مگر حال ہے اب یہ
اِک دوڑ برائی کی ہر اک سمت ہے جاری

وہ وقت بھی نزدیک ہے جب لوگ کہیں گے
اچھا جو ہو مطلوب کرو خوب برائی

اَب عام تصور ہے یہ اچھائی کا ہم میں
اچھائی کا اور اچھے کا معیار ہے دولت

کل تک تو بہت خوب تھا یہ جذبۂ نیکی
نادانی، جنوں سادگی اب نام ہیں اس کے

دولت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں
ہر کام سے، ہر جذبہ سے اب پیسہ بڑا ہے

ہم بھی ہیں مسلمان ، یہ ہے سوچ ہماری
افسوس ہے افسوس ہے افسوس ہے افسوس

فی الوقت اپنی سوچ سے فرصت نہیں ہمیں

دل چاہتا ہے ہم بھی نکھاریں معاشرہ
توڑیں رسوم زیست یہ ہمت نہیں ہمیں

سوچیں گے ہم ضرور ہے کیا ملکی فائدہ
فی الوقت اپنی سوچ سے فرصت نہیں ہمیں

ہے شوق یہ ضرور ملیں سرفرازیاں
توڑیں گدائی کاسہ یہ جرأت نہیں ہمیں

مسلم ہیں پر ہوئے ہیں یوں غفلت شعار ہم
جیسے ذرا بھی خوفِ قیامت نہیں ہمیں

دل سے مٹایا اس طرح ذوقِ جہاد کو
راہِ خدا میں مرنے میں لذت نہیں ہمیں

عشق نبی ﷺ کو چھوڑ کے مستِ فرنگ ہیں
جیسے نبیؑ پاک ﷺ سے نسبت نہیں ہمیں

گھر

دنیا گھر کہتی ہے جس کو
چار دیواری ہوتی ہے
اک چھت بھی اوپر ہوتی ہے
لیکن ہر اِک چار دیواری
یہ نہ سمجھو گھر ہوتی ہے
اِن میں سے کچھ ہوٹل ہیں اور
کچھ دفتر ہیں کچھ ہیں دکانیں
اِن میں لوگ آتے جاتے ہیں
سوتے ہیں ستاتے ہیں
کام بھی مل جل کر کرتے ہیں

دفتر میں اور ہوٹل میں
کمرے سے کمرا ملتا ہے
لیکن ان میں رہنے والے
سب کے سب ان جانے ہیں
دفتر اور دکانوں میں
آنے جانے والے اکثر
ملتے ہیں باتیں کرتے ہیں
لیکن اِن باتوں کا محور
مطلب اور پیسوں کی باتیں
گھر تو وہ ہوتا ہے جس میں
دکھ سکھ ساجھے ہوتے ہیں
رشتے یوں پکے ہوتے ہیں
رشتے یوں سچے ہوتے ہیں
ایک ہنسے تو سب ہنستے ہیں
اِک روئے، سب غمگیں ہو کر
اس کے غم کو دھوتے ہیں

چار دِن کی زندگی

کوئی کہتا ہے اے لوگو
یہ دنیا پھر نہیں ملنی
اڑاؤ عیش کے چھینٹے
چلاؤ دَور ساغر کے
مناؤ اس طرح خوشیاں
کہ غم نزدیک نہ پھٹکے
کرو نہ وقت کو ضائع
کہ دنیا چار دن کی ہے

کوئی کہتا ہے اے لوگو
کرو تم خوف اللہ کا
قناعت کر کے اللہ پر
رکھو ہر روز تم روزہ
تو کاٹو رات سجدوں میں
منا لو اپنے اللہ کو
کرو نہ وقت کو ضائع
کہ دنیا چار دن کی ہے

میں یہ کہتا ہوں اے لوگو
ہے جب کہ زیست کا عنواں
عبارت جسم اور جاں سے
کرو انصاف دونوں سے
سکھایا مصطفےٰ ﷺ نے ہے
اسی پہ ہو رہو عامل
کرو نہ وقت تم ضائع
کہ دنیا چار دن کی ہے

کوڑے کے ڈھیر پر

کوڑے کرکٹ کے اِک ڈھیر پر اک طرف
ایک پاؤڈر کا مارا ہوا نوجواں
میلی چادر میں خود کو چھپائے ہوئے
اس طرح سر جھکائے تھا بیٹھا ہوا
گویا حاجات فطری سے مجبور ہے
مکھیاں بھنبھناتی تھیں چاروں طرف

ایسی بدبو کی لپٹیں تھی اٹھتی وہاں
کہ پراگندہ ہو جائے جس سے دماغ
پر وہ مجبور ہے کہ ''فراغت'' کی جا
اس سے بہتر میسر نہیں ہے اُسے
اس ہی کوڑے کے چوگرد بچے بھی تھے
جو کہ آئے تھے ڈھونڈیں گے کچھ ہڈیاں
وہ پلٹتے تھے کوڑے کو یوں بار بار
جیسے انعامی کوپن ہے یاں گم ہوا
وہ اگر مل گیا تو یقیں ہے انہیں
ان کی تقدیر یک دم بدل جائے گی
کیا ہوا ڈھیر پر مکھیاں ہیں اگر
کیا ہوا ڈھیر گر یہ غلاظت کا ہے
کیا ہوا گر ہیں مجبوریاں مختلف
وہ بھی مجبور ہے یہ بھی مجبور ہے

فرحت عباس شاہ کی کتابوں کے ناموں سے مرتب نظم

''محبت فرض ہوتی ہے''
محبت قرض ہوتی ہے

''محبت ذات ہوتی ہے''
''محبت چپ نہیں رہتی''

''محبت گم شدہ میری''
مجھے جب حد سے تڑپائے

''مرے ویران کمرے میں''
''اداسی ٹھہر جاتی ہے''

''کبھی ملنے، چلے آؤ''
''مجھے تم یاد آتے ہو''

ملازمت کا آخری دن

نوکری کا یہ دن بھی
کچھ عجیب ہوتا ہے

دو طرح کے جذبِ دل
آ کے ایک سنگم پر

اس طرح سے ملتے ہیں
گہ مضطرب کر دیں

گہ دیں سکونِ دل
اضطراب دل کے بھی

دو ہی پہلو ہوتے ہیں
ایک پہلو یہ ہے کہ

نوکری نہیں ہو گی
نوکری سے وابستہ

منفعت نہیں ہو گی
منفعت کے بھی اکثر

دو ہی پہلو ہوتے ہیں
کچھ ہیں میز کے اُوپر

کچھ ہیں میز کے نیچے
دل کی بے قراری کا

دوسرا ہے یہ پہلو
یار چھوٹ جائیں گے

دوست چھوٹ جائیں گے
اور سکون دل کے بھی

دو ہی پہلو ہوتے ہیں
ایک تو ہے یہ پہلو

اک طویل عرصہ تک
فرض منصبی اپنا

پورا کر دیا میں نے
شکر ہے خداوندا

فارغ ہو رہا ہوں میں
جبر اور بندش کی

زندگی نہیں ہو گی
صبح اُٹھ کے دفتر کی

حاضری نہیں ہو گی
فائلیں نہیں ہوں گی

اطمینان قلبی کا
دوسرا ہے یہ پہلو

اپنے گھر کو بچوں کو
اور اپنے اللہ کو

جتنا میرا دل چاہا
وقت دے سکوں گا میں

والدہ مرحومہ کی یاد میں

ماں کی ہستی اس قدر پیاری ہے کہ
ماں کہیں ، امی کہیں، مادر کہیں
جب تلک لب بوسے کو ملتے نہیں
لفظ ''ماں'' لب پہ نہیں آتا کبھی

ماں کسی کی ہو کسی مذہب سے ہو
نسل کوئی ہو ، کوئی بھی رنگ ہو
زندگی کے ہو کسی بھی دور میں
ماں سراپا پیار ہے ایثار ہے

ماں کی عظمت اس سے بڑھ کر کیا کہوں
ساری دنیا میں مُسلَّم اس کا پیار
جو خدا کی عظمتوں پہ شک کریں
ماں کی عظمت سے وہ انکاری نہیں

عمر بھر بچوں پہ رہتی ہے فدا
خون دے کر سینچتی ہے کشتِ جاں
سردی گرمی بھوک بیماری میں کبھی
ماں کی الفت کا شجر کملائے نہ

اچھے اچھے جذبے ہو جاتے ہیں سرد
مامتا شاداب رہتی ہے سدا
بن کے جنت کی ہوا ماں کی دعا
زندگی کی دھوپ میں جلنے نہ دے

ماں پڑھاتی ہے محبت کا سبق
ماں سکھاتی ہے محبت کا عمل

ماں سناتی ہے محبت کا ورق
ماں مجسم مدرسہ ہے پیار کا

ماؤں والو! خوش نصیبو! جان لو
ماں کا کوئی بھی نہیں نعم البدل
اُف کیے بن عاجزی کرتے رہو
اور دامن میں نجاتِ اُخروی بھرتے رہو

ماں کے بن یہ زندگی بے کیف ہے
ماں کے بن بے چارہ بے چارہ ہوں میں
مجھ کو لگتی ہیں دعائیں بے اثر
میری آہیں بھی ہوئی ہیں بے ثمر

ماں کی تربت پر مجھے آئے سکوں
ماں کی تربت مجھ کو ماں جیسی لگے
ہو تری تربت منور نور سے
ماں تری تربت پہ دائم رحمتیں

۸؍اکتوبر ۲۰۰۵

مہینہ رحمتوں اور برکتوں کا
رواں تھا اس میں عشرہ رحمتوں کا
خدا کی حکمتیں جانے خدا ہی
نہ جانے کیوں غضب میں آگیا وہ
ہمیں کیوں امتحاں میں اس نے ڈالا
جھنجھوڑا اس طرح ارضِ وطن کو
قیامت ہر طرف برپا ہوئی تھی
ہزاروں مر گئے لاکھوں تھے زخمی

ہزاروں دب گئے ملبے کے نیچے
کئی آبادیوں کا حال یہ تھا
کہ گویا یہ کبھی آباد نہ تھیں
پہاڑوں کے مکیں اللہ اکبر
غموں کے یوں پہاڑ آئے تھے ان پر
مکانوں کے پہاڑ آئے تھے ان پر
پہاڑوں کے پہاڑ آئے تھے ان پر
ہزاروں حسرتیں چہروں پہ ظاہر
پھٹی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں
ہے اس بھونچال نے ایسا جھنجھوڑا
بہت سے دل شکستہ سے ہوئے تھے
بہت سوں کے کٹے تھے بال و پر سب
تہ و بالا ہوئے کتنے مدرسے
حصولِ علم میں مصروف بچے
اجالا پانے آئے تھے مدرسے
اندھیرے نے گلے ان کو لگایا

مدرسے کے مدرسے تھے زمیں بوس

مٹی اک نسل پوری پڑھتے پڑھتے

اذیت ناک چیخیں اٹھ رہی تھیں

کسی کی ٹانگ ٹوٹی سر پھٹا تھا

کسی کا دل جگر زخمی ہوا تھا

اگر ماں بچ گئی بیٹا تھا زخمی

بہن گر مر گئی بھائی بچا تھا

کہیں سب خانداں ملبے تلے تھا

یہ منظر کب تھا اس قابل کہ دیکھیں

مگر یہ شکر ہے دیکھا سبھی نے

ہوئی ہنگامی صورت جوں ہی ظاہر

بہت سی این۔جی۔او حرکت میں آئیں

ہر اک تھی مستعد اپنی جگہ پر

ہر اِک بڑھ چڑھ کے حصہ لے رہی تھی

خدا ایدھی کو بھی رکھے سلامت

یہ بوڑھا تو جوانوں سے جواں ہے

بڑھے امداد کو پیر و جواں سب
کسی نے جان کو خطرے میں ڈالا
گھسا سینے کے بل ملبے کے نیچے
جہاں تک بن پڑا جانیں بچائیں
جہاں تک بن پڑا مُردے اُٹھائے
لہو اپنا دیا اِنسانیت کو
بنائی ایک زنجیر اُخوت
ہمارے ڈاکٹر اور نرس دیکھو
مسلسل زخمیوں کے درمیاں ہیں
نجانے کتنے لوگوں کو انہوں نے
یقینی موت کے منہ سے بچایا
جواں ہمت مرے فوجی جواں بھی
ہوئے تھے مستعد لمحوں کے اندر
انہوں نے یہ نہ دیکھا کون ہے یہ
انہوں نے یہ نہ دیکھا کس جگہ ہے
انہوں نے یہ نہ دیکھا میرے گھر میں

مَرے ہیں کتنے اور کتنے بچے ہیں
انہیں تھی فکر تو ارضِ وطن کی
جہاں جو بھی ملا اس کو اٹھایا
اٹھا کر اس کو سینے سے لگایا
اٹھا کر گود میں بچوں کو زخمی
شفاخانوں میں جا جا کر لٹایا
ہمارا پی۔ٹی۔وی اک پُل بنا تھا
جہاں سے لمحہ لمحہ کی خبر کو
جہاں سے لمحہ لمحہ کی ضرورت
جہاں سے لمحہ لمحہ کے مناظر
جہاں بھر کو دکھائے جا رہے تھے
ہوے چندے جمع لمحوں کے اندر
کھجوریں ، دودھ پانی اور خیمے
مرے ارضِ وطن کے ہر شہر سے
رواں تھے مستحق لوگوں کی جانب
تھا کشمیر اور ہزارہ دنیا بھر کی

توجہ اور امدادوں کا مرکز
بڑھی ہر قوم انسانیت کے ناطے
جہاں تک ہو سکا امداد لائے
جہاں تک ہو سکا خود چل کے آئے
ہماری قوم نے ہمت دکھائی
ہماری قوم نے غیرت دکھائی
سلام اس قوم کے عزم جواں پر
عمل سے جس نے دنیا کو بتایا
''اگر ہو جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے''

طنز و مزاح

ٹائیفائیڈ کا ٹیکہ لگنے پر

ٹائیفائیڈ کا لگ گیا ٹیکہ
اَب عناصر میں اعتدال کہاں

انتہا کو ہے پہنچی کمزوری
اَب صحت کو مری زوال کہاں

خود مٹائیں جو رونق گلشن
پھر ہو گلچیں کا احتمال کہاں

اعضا شکنی گزر گئی حد سے
شاعری کی مجھے مجال کہاں

خود جو بن جائیں ناتواں آنسؔ
ناتوانی کا پھر سوال کہاں

جمہوریت

خوشی ہے دھوم دھام ہے
ہر ایک شاد کام ہے
ہمارے ہاتھ ہی میں آج
قوم کی لگام ہے
جمہوریت ہے آگئی

ہر ایک کا خیال ہے
وہ قوم کا کمال ہے
اگر وہ مشورہ نہ دے
تو قوم کو زوال ہے
جمہوریت ہے آگئی

پرمٹوں سے شان ہے
کوٹھیوں میں جان ہے
کوئی کسی سے کم نہیں
ہر ایک پاٹے خان ہے
جمہوریت ہے آگئی

گراں ہوا اناج ہے
عوام کا یہ راج ہے
آبرو خدا رکھے
اُسی کے ہاتھ لاج ہے
جمہوریت ہے آگئی

کبوتر

غٹرغوں رات دن کرنا یہی بس کام ہے تیرا
بہت بھولی سی عادت ہے کبوتر نام ہے تیرا

فضاؤں میں اُڑا کچھ دیر پھر دانہ چگا کابک میں جا بیٹھا
طریقہ زندگی بھر کا یہ صُبح و شام ہے تیرا

اِدھر بیٹھیں اُدھر بیٹھیں یہاں بیٹھیں وہاں بیٹھیں
یہی ہے فائدہ تیرا یہ فیضِ عام ہے تیرا

ہیں تیرے پَر تو شاہیں سے مگر عادت غُلامانہ
اِسی کمزوری کے باعث مقدر دام ہے تیرا

تو پابندِ نشیمن ہے ثنا کیسے کروں تیری
وفا تو جس کو سمجھا ہے خیالِ خام ہے تیرا

اشیا کی گرانی

ایک ناکامِ محبت سے یہ کل میں نے کہا
اپنی ناکامی کے اسباب و عِلل مجھ کو بتا

یہ سوال ایسا تھا جس کو سُنتے ہی وہ رَو پڑا
روتے روتے اُس نے مجھ پہ ایک طعنہ یوں جڑا

شرم کچھ آتی نہیں تم لوگ ہو کتنے عجیب
چھیڑ کے قابل نہیں باقی رہے اَب ہم غریب

اِک زمانے تک وہ میری اُس کا میں محبوب تھا
پاس ہم کو کچھ نہیں تھا عشق کے آداب کا

کہ یکا یک ایسی مہنگائی نے آگھیرا ہمیں
آہ! ہمدم کیا بتاؤں داستاں اپنی تمہیں

وہ ستم پیشہ نہیں سُنتی ہے اب تو بات بھی
یک قلم موقوف کر دی ہیں وہ باتیں پیار کی

اس قدر اشیاء کی مہنگائی ہوئی ہے شہر میں
اُس کی فرمائش کو اَب ہم کس طرح پورا کریں

سُرخی پوڈر عطریات و چوڑیاں اور ساڑھیاں
کیسے ممکن تھا کہ پوری کرتا اس کی جوتیاں

اور جب تک خواہشیں اس کی نہ میں پوری کروں
حیف ہے پھر اُس کی الفت کا میں دم کیسے بھروں

ہائے ہائے کیا کروں دِل حوصلہ پاتا نہیں
جیب خالی ہو تو وہ کیوں کر نظر آئے کہیں

وہ زمانہ اَب کہاں کی دوستی بے لوث ہو
اَب تو پہلے دام دو اور پھر کسی کا دَم بھرو

جاؤ آنِسؔ کچھ کرو، پر جیب کو اپنی بھرو
وہ بیچاری ڈھونڈتی ہو گی کسی محبوب کو

صدارتی ریفرنڈم

ساکنانِ قوم تم سے کرتا ہوں میں اِک سوال
دو جواب ہاں میں یا نہ میں یہ نہیں کارِ محال
یہ جو جالی دار ٹوپی پہنتا ہوں میں سدا
کیا فزوں ہوتا ہے اِس سے میرا کچھ حسن و جمال؟

گر جواب اس کا تمہاری سمت سے مثبت ہوا
پانچ سالوں کے لیے میں صدرِ مملکت ہوا

مرد کے چہرے پہ لمبی لمبی موچھیں ہیں فضول
موچھیں کاٹو ڈاڑھی رکھو ہے یہ اسلامی اصول
گرچہ میں عالم نہیں مُلّا کا بیٹا ہوں ضرور
میرا یہ فتویٰ کہو تم کو بھی ہے دل سے قبول؟

گر جواب اس کا تمہاری سمت سے مثبت ہوا
پانچ سالوں کے لیے میں صدرِ مملکت ہوا

ملک میں میں نے دیا ہے شیروانی کو رواج
قائداعظم کی اچکن کی رکھی میں نے لاج
سچ کہو اس رسم کو میں نے نہیں جاری کیا
بس یہی دریافت کرنے کو تو میں آیا ہوں آج؟

گر جواب اس کا تمہاری سمت سے مثبت ہوا
پانچ سالوں کے لیے میں صدرِ مملکت ہوا

ہے بہت سنجیدہ مسئلہ میں نے ہے جو کچھ کہا
بادلِ نخواستہ ہے تم نے جو اب تک سہا
آج مجھ کو یہ بتا دو ہے مجھے کچھ اختیار
لوں ستّر کے شہیدوں کا میں تم سے خوں بہا؟

گر جواب اس کا تمہاری سمت سے مثبت ہوا
پانچ سالوں کے لیے میں صدرِ مملکت ہوا

میرے ماضی کو تو دیکھو میں نے ہے کیا کیا کِیا
کِس جماعت کو ہے چھوڑا کس کو ہے رستہ دیا
فکر مستقبل نہ کر سب کچھ خدا پر چھوڑ دے
ہاں مگر اتنا بتا کیا میں نہیں جنرل ضیاء

گر جواب اس کا تمہاری سمت سے مثبت ہوا
پانچ سالوں کے لیے میں صدرِ مملکت ہوا

ابنِ انشاء سے معذرت کے ساتھ

کل ماہ کی آخیر تھی
دن بھر رہا جھگڑا ترا

بیگم تری کہتی تھی یہ
بازار جا شاپنگ کرا

لیکن بصد منت اُسے
تو تو یہی کہتا رہا

اس ماہ کی آخیر میں
کیسے کریں شاپنگ بتا

ہم بھی وہیں موجود تھے
دیوار تھی حائل ذرا

اس ماہ کی آخیر کا
ہم پر اثر کچھ نہ پڑا

ہم نے ترا جھگڑا سنا
بیگم کو گاڑی میں بٹھا

شاپنگ کرا برگر کھلا
تفریح کرا واپس ہوا

جب سیر سے واپس ہوا
جھگڑا ترا جاری رہا

ہم ہنس دیے ہم چپ رہے
منظور تھا پردہ ترا

حقیقی محبت

شکل گر معمولی تھی تو کیا ہوا
وہ اُسے جاں سے زیادہ تھا عزیز
اِس کو اُس سے قدر الفت تھی کہ
ان کا رشتہ مثلِ جسم و جاں تھا
ناگہاں اک دِن وہ اس سے روٹھ کر
یوں گیا کہ اس کو بے سدھ کر گیا
اُس کے بن وہ یاس کی تصویر تھی
راہ تکتی رات دِن اس آس میں
وہ پلٹ آئے گا اک دن اس کے پاس
راستہ تکتی رہی صبح و مسا

ایک دن قسمت سے اس کے یہ ہوا
گھر کے دروازے پہ وہ خود آگیا
جھٹ پکڑ کر ہاتھ گھر لائی اسے
اتفاقاً تھی اکیلی گھر میں وہ
پیار سے اس کو بٹھا کر پاس ہی
انگلیاں سر پر وہ اس کے پھیرتی
اور محبت سے یہ کہتی جان جاں
تیرے بن میں ایک زندہ لاش تھی
کیوں مجھے تو چھوڑ کر تھا چل دیا
سوچتی ہوں رات دن تیرا بھلا
تو غلط سمجھا تھا اُس دن بھی مجھے
میرا تیرے بن جہاں میں کون ہے
میں تو اُس دن بھی بلاتی رہ گئی
کیا سمجھتا ہے میں تیری ماں نہیں

اے بھولے بادشاہو!

اے بھولے بادشاہو
سچ کہہ رہا ہوں تم سے
اتنی بڑی حماقت
ہے تم کو زیب دیتی
جب شیر سَو رہا تھا
تم کو تھی کیا ضرورت
کیوں چھوڑ کر پٹاخے
اس شیر کو جگایا
یہ شیر اٹھ کے دیکھا
چاغی پہ جا کے گرجا

اس آسماں نے دیکھا
سارے جہاں نے دیکھا
تم اپنے گھر کے اندر
کیسے ڈرے ڈرے تھے

اے بھولے بادشاہو
سچ کہہ رہا ہوں تم سے
ہے تم کو زیب دیتی
تم نے سبق نہ سیکھا
پھر کی نئی حماقت
اِگنی کے پرتھوی کے
تم نے اُٹھا کے بھالے
پھر شیر کو پکارا
اس شیر کو پکارا
جس شیر کے ہیں پنجے
شاہین اور غوری

اے بھولے بادشاہو
سچ کہہ رہا ہوں تم سے
اتنی بڑی حماقت
ہے تم کو زیب دیتی
اب تم کو مشورہ ہے
انسانیت کے ناطے
اس شیر کو نہ چھیڑو
گر کی نئی حماقت
پھر بچ نہیں سکو گے
کب تک یہ درگزر کا
اب سلسلہ چلے گا
یہ شیر دیکھ لینا
آخر کو تنگ آکر
تم کو بھنبھوڑ لے گا
اے بھولے بادشاہو
سچ کہہ رہا ہوں تم سے

کہانی بچوں بڑوں کے لیے

میں تو تفریح کو گیا تھا خوب ہی گھوما پھرا
گھومتے پھرتے نظر آئی مجھے بارات اِک
دیکھا جب نزدیک جا کر شیر تھا دولہا بنا
پیچھے پیچھے جا رہے تھے جانور بارات میں
اِک اچھلتا کودتا چوہا بھی تھا بارات میں
اس کی خوشیاں ہو رہی تھیں اس کے چہرے سے عیاں
میں نے کچھ نزدیک جا کر اس سے پوچھا اے میاں
اس قدر دِل شاد کیوں ہو کچھ خبر ہم کو بھی ہو
چوہے نے گردن اُٹھا کر فخر سے مجھ سے کہا
یہ جو ہیں دولہا میاں یہ میرے چھوٹے بھائی ہیں
میں نے حیرت سے کہا وہ شیر اور چوہے ہو تم
چوہا کچھ شرمایا پھر گردن جھکا کر یہ کہا
شادی کر لینے سے پہلے میں بھی ایسا شیر تھا

آج کل کے یہ بچّے

دیکھو تو آج کل کے یہ بچے
پیدا ہوتے ہی آنکھ کھولے ہیں

آنکھ کھولے پٹر پٹر دیکھیں
سامنے ان کے ٹی۔وی یوریا ہے

دائیں کمپیوٹر گویا ''سنڈافاس''
بائیں کیبل کی ''پولٹن سی'' ہے

یہ دوائیں اثر دکھاتی ہیں
ان کے بچپن سے بھول پن کو یوں

چند سالوں میں ہی بھگاتی ہیں
کشت ہستی میں بھولپن جیسے

''دبنی ہنٹی'' ہے یا ہے ''جنگلی جی''
دیکھو تو آج کل کے یہ بچے

ایسے اظہارِ ذات کرتے ہیں
جیسے سقراط ہیں یا افلاطوں

مجھ کو ہرگز نہیں ہے شک اس میں
ایسے ایسے ہیں بے شمار امکاں

جن میں یہ اپنے باپ دادا سے
ہیں عمل میں شعور میں آگے

کچھ وہ پہلو ہیں آگہی کے جہاں
ان کا آگے نکلنا خوب ہوا

لیکن ایسے بھی بعض پہلو ہیں
پیچھے رہتے تو خوب تر ہوتا

قطعات

ختمِ قرآن کے موقع پر

ختمِ قرآن ہو رہا ہے آج
فضلِ رحمان ہو رہا ہے آج
لیلۃ القدر بھی میسر ہے
ہم پہ احسان ہو رہا ہے آج

رسومات

زمانہ نہ جانے کہاں جا رہا ہے
ہو کھانا یا پینا رسومات ہیں
ولادت ہو بچپن، جوانی، ضعیفی
ہو مرنا یا جینا رسومات ہیں

شیطان اور چیلے

شیطان نہ خود راندہ درگاہ ہوا ہے
بد بخت نے ہے کتنوں کی کشتی کو ڈبویا
عبرت کا نشان بن کے نہ لی اس نے نصیحت
چیلے بھی لگاتار ہیں بد بختی کے جویا

ایم۔اے۔کرنے پر

ہو گئے ہیں حبیب ایم۔اے پاس
درجہ اوّل ہے آیا ان کو راس
اے خدا جلد نوکری بھی ملے
کاٹنے کی نہ آئے نوبت گھاس

تاریخ وفات حضرت نانا ابا صاحب مرحوم

آپ کے جانے کا مرے نانا
اس قدر دکھ ہوا ہے آنسؔ کو

جب کہی انتقال کی تاریخ
"آہ بداغِ فراق" آئی ہے
۱۳۹۴ ہجری

حدیث شریف کا مفہوم

طاقت ہے جو بازو میں تو، تو روک لے بڑھ کر
ایسا نہیں کر سکتا تو ، لے روک زباں سے
یہ بھی نہیں کر سکتا تو، دل میں ہی بُرا جان
لیکن یہ ہے ایمان کا، کمزور سا درجہ

علی رضا کی فرمائش پر

رکھو عزم و یقیں دل میں ، بلند ہمت رہو یارو
یہی جوہر تو کرتے ہیں ، اولو العزمی کی غمازی

اگر اک قطرہ خوں ہے تو ، اگر تھوڑے سے پر ہیں تو
چلے آؤ مری جانب ، سکھاؤں تم کو شہ بازی

بجٹ

ایک سرکاری ملازم نے بجٹ سن کر کہا
شہر سے اب بوریا بستر اٹھانا چاہیے
اس طرح مقروض رہ کر جی سکوں گا کب تلک
اب کوئی ویرانہ ہی جا کر بسانا چاہیے

بجٹ آرہا ہے

بہت بھاری قدموں کی آہٹ ہے آتی
یوں محسوس ہو مولا جٹ آرہا ہے
جسے دیکھو لگتا ہے لرزاں و ترساں
جو پوچھا، کہا کہ بجٹ آرہا ہے

تحریک انصاف

ہے بجا آج مسئلہ ہے یہی، سستا فوری یقینی عدل ملے
روٹی کپڑا امکان سے بڑھ کر ہم کو انصاف کی ضرورت ہے
بات یہ بھی ہے سوچنے والی، کتنے وعدے یہاں ہوئے پورے
ہو بھروسہ عوام کو کس پر اور انصاف کی کیا صورت ہے

اے استاد

اللہ نے تجھ کو دی تھی مشعل
چمکا کے تجھے دیا بنایا
تو جب سے بجھ گیا ہے افسوس
ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا

گدھے کے سر پر سینگ نہیں

خالی از حکمت نہیں، اس کا تو کوئی کام بھی
ابتدا ہونے سے پہلے، جانے ہے انجام بھی
وہ اگر چاہتا تو دے دیتا، گدھے کو سینگ بھی
بالیقیں زحمت ہی ہوتا، اس پہ یہ انعام بھی

تقریبات

بسم اللہ

برکتیں اس میں بے تحاشہ ہیں بہتریں ہے کلام بسم اللہ
پیارے بچے صفی ملیحہ بھی پڑھتے ہیں آج شام بسم اللہ

رحمتوں کا نزول ہوتا ہے اور نبی ﷺ کی رضا اسی میں ہے
آج پڑھ کر نہ بھول جانا اِسے پڑھتے رہنا مدام بسم اللہ

علم کی طے کرو منازل تم، نام پیدا کرو جہاں میں تم
زندگی کی ہر ایک منزل پر رحمتوں کا پیام بسم اللہ

جو پڑھے ابتدا میں بسم اللہ رحمتوں کا نزول ہوتا ہے
شاد و خرم یہ تم کو رکھے گی باعثِ لطفِ عام بسم اللہ

شکر آنسؔ کرو کہ بسم اللہ ہو گئی ہے صفی ملیحہ کی
ہو گئی ختم آج کی تقریب نوشِ جاں ہو طعام بسمِ اللہ

بہ تقریب عقیقہ سیدہ صباحت فاطمہ
آلِ نجیب پیرزادہ کی فرمائش پر

عقیقہ ہو گیا تیرا مبارک باد دیتا ہوں
یہ دِل خوش ہو گیا میرا مبارک باد دیتا ہوں

تری امی بھی ابو بھی تری دادی بھی دادا بھی
ہیں فرحاں نانی و نانا مبارک باد دیتا ہوں

تُو پائے عمر نوح اور بخت بھی بخت سکندر ہو
ترے حق میں دُعا کرتا مبارک باد دیتا ہوں

بڑھے پھولے پھلے خوش ہو ترا اقبال روشن ہو
مبارک ہو ترا آنا مبارک باد دیتا ہوں

تو چھ ماہ میں چلے گھٹنے تو نو ماہ میں کھڑی بھی ہو
ہو پھر اِک سال میں چلنا مبارک باد دیتا ہوں

تو فرخ بھی ہے شازی بھی سُنا ہے آسیہ بھی ہے
بتا خود ہی تو ہے کیا کیا مبارک باد دیتا ہوں

تمہارے نانا ابا نے تمہارا نام پیارا سا
صباحت فاطمہ رکھا مبارک باد دیتا ہوں

نجیب پُر خلوص و باوفا کی گود میں آجا
تجھے میں گود میں لیتا مبارک باد دیتا ہوں

رسمِ آمین

ابرِ رحمت چھا گیا سامانِ باراں ہو گیا
ہو مبارک آج تیرا ختمِ قرآن ہو گیا

اس کا پڑھنا دیکھنا اس پر عمل کرنا ثواب
برکتوں میں گھر گئے احسان یزداں ہو گیا

اس کتاب اللہ سے جس نے بھی پائی روشنی
اضطراب دِل مٹا جینے کا دوراں ہو گیا

زندگی میں اہمیت اس کی مسلّم اس قدر
کم سے کم بھی اِک دفعہ پڑھنے کا فرماں ہو گیا

جس نے اس کے نصف سے بھی نصف سے بھی نصف پر
کچھ عمل دل سے کیا ہے وہ بھی ذی شاں ہو گیا

باعمل ہم کو بھی کر دے اے خداوند جہاں
اُمتِ مرحوم کا کمزور ایماں ہو گیا

کاش سُنتے سورۃ رحمٰن تجھ سے ابا جی
وہ بھی خوش ہوتے کہ تجھ پر فضلِ رحمان ہو گیا

سورۃ رحمٰن جس دم تو نے محفل میں پڑھی
خالہ اماں کا تری دل کیسا فرحاں ہو گیا

دادا دادی کی دعائیں تھیں تمہارے ساتھ ساتھ
اس طرح قرآں پڑھنا تم کو آساں ہو گیا

ہو گئی آمین تیری اے مری پیاری بہن
اُس رسولِ ہاشمی کا ہم پہ احساں ہو گیا

پورا آنِسّ سرورِ کونین کے صدقہ میں آج
پھوپھی جاں اور پُھپا جاں کے دِل کا ارماں ہو گیا

رخصتی (۱)

اُس نئے گھر میں جا کے گھر کرنا
کام ہر ایک پُر اثر کرنا

جاتی ہو آج دوسرے گھر کو
عمدگی سے وہاں بسر کرنا

آج جو امتحان ہے در پیش
ہر طرح سے اُسے ہے سَر کرنا

پاس عرفان کے مگن رہنا
یاد ہم کو بھی تم مگر کرنا

خواجۂ ہند کی ہو تم پوتی
پیروی اُن کی سر بسر کرنا

عین فطرت ہے آج کا رونا
وقت رونے کا مختصر کرنا

پونچھ دیتی ہوں اب تو میں آنسو
پھر نہ دامن کو اپنے تر کرنا

خوب پھولو پھلو سدا خوش ہو
اُس کی رحمت پہ تم نظر کرنا

آؤ رخصت کرو بہن کو اَب
دل کو قابو میں تم مگر کرنا

رُخصتی (۲)

جدائی بہن بیٹی کی ہمیشہ شاق ہوتی ہے
بہن بیٹی بھی اِس لمحہ بہت زیادہ ہی روتی ہے

ہیں بے بس والدین اِس میں کہ قدرت یہ ہی چاہتی ہے
وداع کر دیتے ہیں اس کو وہ کتنا روتی دھوتی ہے

ولیکن کچھ ہی لمحوں میں خدا کی مہربانی سے
یہی قدرت یکایک تُخمِ الفت دِل میں بوتی ہے

یہ الفت کا شجر اتنا تن و من ہوتا اِک دِن
یہی بیٹی بہن بابل کے گھر مہمان ہوتی ہے

ہے یہ قانون فطرت کا نہ روؤ فوزیہ تُم بھی
تقاضا ہے یہ مذہب کا تو کیوں آنسو پروتی ہے

سُکھی رکھے تجھے اللہ گھر میں اپنے شوہر کے
تو ہنستی کھیلتی اَب جا کیوں دامن کو بھگوتی ہے

مرے خالو پُھپا ماموں چچا خالہ ممانی کی
چچی پھپّی کی بیٹی ہے مرے دادا کی پوتی ہے

ہے خوش قسمت بہت اے فوزیہ احسان ہے رب کا
تری سسرال ہیرا ہے تو شوہر تیرا موتی ہے

دُعا آنِسؔ کی ہے تیرے گلستاں میں وہ گُل مہکیں
ہمیشہ جن پہ بُلبل عاشق و قربان ہوتی ہے

رُخصتی (۳)

تم سدا پھولو پھلو میری بہن
اور ہمیشہ خوش رہو میری بہن

بھائیوں بہنوں سے امی ''آن'' سے
کس قدر نزدیک ہو میری بہن

ہے تری سسرال بھی میکہ ترا
بے خطر اس گھر چلو میری بہن

دیکھے بھالے سنبھلے بھائی ہیں مرے
یوں نہ دل میلا کرو میری بہن

حق نے تم کو جن سے وابستہ کیا
اُن کو اَب تم خوش رکھو میری بہن

زیرِ سایہ اَب قرآن پاک کے
آؤ اپنے گھر چلو میری بہن

طاقِ نسیاں پر نہ رکھنا تم ایسے
ہاں عمل اس پر کرو میری بہن

رخصتی (۴)

گھر بسانے کے لیے جاتے ہوئے
یوں نہ دامن کو بگھونا چاہیے

سنتِ نبوی ہے اور منشائے رب
شکر کا اظہار ہونا چاہیے

ہو اگر جذبات سے آنکھوں میں نم
جا کے منہ چپکے سے دھونا چاہیے

چاہیے غالب رہے فرخندہ رنگ
ایسے موقعوں پر نہ رونا چاہیے

صرف خوشیوں کو سجانے کے لیے
اشک کے موتی پرونا چاہیے

الوداع بہنوں کو کہنے کے لیے
اک الگ دل گردہ ہونا چاہیے

ہے بجا آنسؔ بجا بالکل بجا
درحقیقت ایسا ہونا چاہیے

رخصتی کے وقت لڑکی کے جذبات

آنکھ کھولی جہاں وہ تھا بابل کا گھر
شاد تھا ہر گھڑی میرے دل کا نگر
مجھ کو درپیش ہے آج کیسا سفر
چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا آج جانا پڑا

بہن بھائی تھے، ماں باپ بھی تھے ادھر
جن پہ پڑتی نظر میری شام و سحر
میرا سرمایہ تھی اُن کی میٹھی نظر
چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا آج جانا پڑا

مجھ کو ماموں چچا تھے گھنیرے شجر
اور ممانی، چچی سب بہت پُر اثر
پھپا پھپّی کا تھا میرے دل میں بسر
چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا آج جانا پڑا

خالو خالائیں سب پیار ہیں سر بسر
مجھ کو کہتے ہیں سب آج با چشم تر
ہے وہی تیرا گھر کر نہ دامن کو تر
چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا آج جانا پڑا

بھانجا بھانجی میرے شمس و قمر
اور بھتیجے تھے جیسے ہوں گل و ثمر
مجھ کو تھی ہر بھتیجی مثال مہر
چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا آج جانا پڑا

بھاوج بہنوئی تھے مخلص و با ہنر
سارے رشتے یہاں تھے بہت معتبر
کر کے جذب دلی آج ان کی نذر
چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا آج جانا پڑا

قومی سہرا

اطہر ہو گئے بامراد پاک سر زمین شاد باد
ڈاکٹر زندہ باد تابندہ پائندہ باد

بڑھیں پھلیں سدا عوام شادیاں ہوں صبح و شام
یوں ہی رواں ہے آج تک پاک سر زمین کا نظام

ہو مثلِ فوج جس کی آل نہ ہو اُسے کوئی ملال
ہمیشہ اُس کے ہاتھ ہے پرچم ستارۂ ہلال
سایہ خدائے ذوالجلال

سہرا(۱)

جس کی خواہش ہر ایک دِل میں ہو
وہ سہانا سا خواب ہے سہرا

جس کے پاؤں میں بلیاں ہوں بندھی
اُس کو اک احتساب ہے سہرا

سب کے دِل میں بسیرا کرتا ہے
ایسا حضرت جناب ہے سہرا

خوب گرمی میں جو نظر آئے
ایک عُمدہ سراب ہے سہرا

یہ ادب بھی ہے اور علم حساب
خشک و تر سی کتاب ہے سہرا

دوستوں کی ہر ایک محفل سے
اِک رہِ اجتناب ہے سہرا

باوجود اس کے یہ نہیں کہتا
کہ یہ رسمِ خراب ہے سہرا

خوبیاں اس میں بے تحاشا ہیں
جب ہی بندھنا ثواب ہے سہرا

ہے مرا تجربہ یہی آنِسؔ
نشۂ بے حساب ہے سہرا

سہرا (۲)

سر پہ اظہر کے بندھ گیا سہرا
بندھ گئے آج بندھ گیا سہرا

سب کے دِل سے دعا نکلتی ہے
خوب مہکے سدا ترا سہرا

والدین اور سب ہی بھائی بہن
دیکھتے ہیں اُٹھا اُٹھا سہرا

ایک مدت سے آرزو تھی لکھوں
شاعرانہ مزاج کا سہرا

یعنی اُس بھائی کا لکھوں سہرا
جس نے سب کے لیے لکھا سہرا

آخرش کامیاب ہو ہی گیا
بعد دقت رقم ہوا سہرا

اِس خوشی میں بھی میں پریشاں ہوں
گرچہ ہے شوق سے لکھا سہرا

کوئی مجھ سے یہی نہ کہہ بیٹھے
یہ کہاں سے چُرا لیا سہرا

میں بانگِ دُہل یہ کہتا ہوں
کوئی چوری نہیں مرا سہرا

دولہا سے میں نے خود کہا تھا منیر
اور انہوں نے ہے لکھ دیا سہرا
(اپنی شادی پر برادرم سید آلِ منیر کی جانب سے)

فرد

غم سے قائم ہے جہاں کی زندگی
اس لئے میں غم کا غم کھاتا نہیں

....

رات کو جب بھی مری چاند پہ جاتی ہے نظر
اُن کے معصوم سے چہرے کا خیال آتا ہے

....

زخمِ الفت سمجھ کے سہ لینا
یاد رکھنے کا اِک بہانا ہے

....

عشق کو کھیل سمجھتا ہے زمانہ آنسؔ
ہے یہی بندے کو خالق سے ملانے والا

....

میں خود سراپا دید کا منظر ہوں بن گیا
کر کے نگاہ کو وقف تیری دید کے لیے

اُن سے کہہ دو کہ ذرا خواب میں آیا کیجیے
دور رہنے سے محبت کا گماں ہوتا ہے

....

کہاں کی دوستی کیسی مروت اور کیا شکوہ
وہ اب آئے تو کہہ دوں گا میرے جومنہ میں آئے گا

....

میرا غم اُن کی خوشی، اُن کی خوشی میری خوشی
پھر کیوں نہ دیوانہ بنوں اور کیوں نہ سودائی رہوں

....

آنِسؔ گُم کردہ راہ کو بخش دیجو اے خدا
گر عمل اچھے نہیں اُمّت تو ہے محبوب کی

....

بہت سوچا کیا میں رات دن اسی رازِ ہستی کو
مگر سمجھا تو یہ سمجھا کہ اب تک کچھ نہیں سمجھا

....

''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ''
کبھی کبھی یہی زن ڈالتی ہے رنگ میں بھنگ

غم دنیا سے ہی فرصت نہیں ملتی ورنہ
جی یہ چاہتا ہے ہر اک آن تجھے دیکھا کروں

....

گراؤ بجلیاں نشتر چلاؤ، تیر برساؤ
ہمارا جرم ثابت ہے تمہیں خوباں جو کہتے ہیں

....

گرانی کا آخر کہاں تک بیاں ہو
خلوص اور الفت بھی نایاب ہیں

....

اس طرح آپ میرے گھر میں رہیں
جس طرح آپ اپنے گھر میں رہیں

....

ابر چھایا ہوا ہے چاروں اور
چاند نکلے تو کس طرح نکلے

....

سر جھکاؤ گے تو پتھر دیوتا ہو جائیں گے
سر اٹھایا تو لگیں گے دیوتا پتھر تمہیں

دانائی و حکمت سے ہے لبریز یہ قرآں
عامل نہیں قرآن پہ افسوس یہ قاری

....

چاند جب چمکا فلک پر، میں نے یہ مانگی دعا
اے خدا میرے وطن میں روز روزِ عید ہو

....

گلاب

آنکھ ہے تو گلاب کو دیکھو
سارے پھولوں کا بادشاہ ہے یہ
ہر گلستاں کی آبرو ہے یہ
رنگ اس کے حسین ہیں سارے
پتی پتی میں اس کی نزہت ہے
پتی پتی میں اک لطافت ہے
پتی پتی میں اک نزاکت ہے
یہ کھِلا ہو یا ادھ کھِلا دیکھو
ہر طرح سے یہ جانِ گلشن ہے
خوبیوں اور کمال کے ہوتے
بیچ کانٹوں کے پرورش پائے
پاگیا ہے یہ راز ہستی کا

خاک ہی میں ہے زندگی اس کی
اپنی فطرت میں منکسر ہے یہ
گاہ صوفی کی خانقاہ میں ہے
گاہ رندوں کے ہاتھ میں پہنچے
گاہ عشرت کدے میں پہنچے ہے
گاہ درویش کے مزار پہ ہے
ترجماں ہے لطیف جذبوں کا
روح پرور ہے جانِ محفل ہے
یہ محبت کی اِک علامت ہے
نفرتوں سے یہ دور رہتا ہے
نفرتیں اِس سے درو رہتی ہیں
غم کی محفل میں غمزدہ سا لگے
اور شادی میں شادمان رہے
کاش ہم سب بھی اس سے بن جائیں

یکم مئی (یوم مزدور)

پھول عاشق کا نمائندہ ہے، مانو جاناں

تم کو دنیا نے کہا پھول یہ نادانی ہے
پھول تو میں ہوں کہ عاشق ہوں تمہارا جاناں
تم ذرا غور کرو پھول کی فطرت کیا ہے
جو اسے توڑے اُسے بھی یہ مہک دیتا ہے

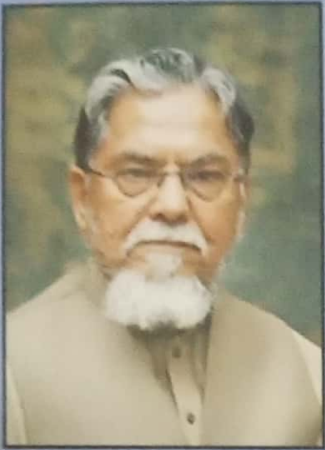
شاخ سے ٹوٹنے کا درد یہ سہتا ہی نہیں
درد کو بھول کے ایثار کی حد کو چھُو لے
توڑنے والے کے ہونٹوں پہ تبسم لائے
زندگی اس کے گزرتی ہے سدا کانٹوں میں

اس کی ہر پتی جُدا کر دے اگر پھول شکن
پتیاں ٹوٹ کے قدموں میں بکھر جاتی ہیں
ہار بن کر یہ کبھی اس کے گلے سے لپٹے
توڑنے والے کی محفل کو سجائے ہنس کر

عشقِ صادق کے سبب ہار نہیں مانتا یہ
عرق بن کر کبھی مہکے تو کبھی عطر بنے
آخری وقت تلک ساتھ نبھاتا جائے
کتنے معشوق دِکھاتے ہیں یہ اندازِ نیاز

تم میں اور پھول میں کچھ قدریں مماثل ہیں اگر
مجھ میں اور تم میں بھی کچھ قدریں مماثل ہوں گی
میں بھی اِنسان ہوں اور تم بھی ہو انساں جاناں
لیکن معشوق ہو تم اور میں عاشق جاناں

اور جہاں تک کہ تعلق ہے حسیں ہونے کا
عشق کا رنگ ہی عاشق کو حسیں کرتا ہے
خود ہی انصاف کرو میں نہیں کہتا جاناں
پھول عاشق کا نمائندہ ہے مانو جاناں



''عشق مری انتہا'' سید آل اظہر آنس کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل نعت اور منقبت کا مجموعہ ''اشکِ سَحَر گاہی'' منظر عام پر آچکا ہے۔ جو اُن کی تخلیقی صلاحیت کا بھرپور غماز ہے۔ ''عشق مری انتہا'' کی غزلوں میں آنس صاحب نے غزل، پابند نظم، معرّیٰ نظم، قطعہ اور فرد کی صورت میں اپنے شعری تجربے کی ترسیل کی ہے۔ غزلوں کے تخلیقی تجربے کی تہہ میں ایسا شاعرانہ شعور ملتا ہے جو زندگی کو خودی اور بے خودی، معلوم نا معلوم، موجود اور ماورا اور طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی حقائق کی روشنی میں دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے انہوں نے زندگی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نہ صرف اپنی داخلی Urge سے ناطہ جوڑا ہے بلکہ اپنی سماجی، اخلاقی، تہذیبی اقدار کو راہ نما بنا کر اپنے احساس، جذبہ اور شعور کو غزل میں اس طرح سمویا ہے کہ حقیقی اور مجازی عشق کی حدود ایک دوسرے سے ملتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے ہاں عشق کمال حاصل کرنے کی سعی کا نام ہے۔

اس مجموعہ میں شامل نظمیں سنجیدہ موضوعات پر ہوں یا طنز و مزاح کے روپ میں بلکہ آنس صاحب کے قطعات بھی اپنے عہد کی تہذیب و معاشرے اور اس کے زوال کا ایک وسیع تر تاریخی اور تہذیبی تناظر رکھتے ہیں۔ آپ جوش کردار سے تقدیر کے راز کھولنے کے لیے مخلص داعی اور راہبرِ قوم کی طرح معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی اصلاح کے لیے سرگرم عمل رہنا چاہتے ہیں۔ ان کی کُل شاعری ایک ایسے صاحبِ دل کا اسلوب رکھتی ہے جو کاسۂ گدائی توڑ کر ہمارے عہد کے جبر و استبداد، بے یقینی اور بے حسی کو ختم کر کے ہماری ایمانیاتی اساس کو مضبوط کرتی ہے۔

ڈاکٹر یٰسین آفاقی

تصانیف و تالیفات

- اَشکِ سَحَر گاہی (نعت اور منقبت)
- خواجہ غریب نواز اجمیریؒ کے حقیقی سجادہ نشین
- لوازم صحتِ تحریر (کتابچہ)

غیر مطبوعہ

- سدا بہار (فارسی اشعار کا منظوم مفہوم)
- یادیں
- سرسید کے معترضین' تنقیدی تحقیقی جائزہ
- ابن الوقت کے بنیادی مباحث اور سرسید تحریک